"شہیدِ مظلوم، حضرت عثمان غنیؓ" کے بعد مرکزی انجمن کی مطبوعات میں

ایک خوشگوار اضافہ

خلیفۂ رابع حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب پر مشتمل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک نہایت مؤثر اور جامع خطاب

مثیلِ عیسیٰؑ --- علیؓ مرتضیٰؓ

اب کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات ۵۲، عمدہ طباعت، قیمت (اشاعت عام) -/۷ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی سے عمومی استفادے اور

عربی زبان کی تحصیل کے لئے

خط و کتابت کورس

(زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور)

میں داخلہ لیجئے اور گھر بیٹھے قرآن حکیم کی رہنمائی اور عربی زبان کی تدریس

سے فائدہ اٹھایئے

ہر دو کورس کے پراسپکٹس، داخلہ فارم اور دیگر تفصیلات شعبہ خط و کتابت کورس،

قرآن کالج، ۱۹۱-اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۵ سے طلب کریں

فون : 833637-833638

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۴ | صفر المظفر ۱۴۱۶ھ جولائی ۱۹۹۵ء | شمارہ ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱داؤد منزل متصل شاہ بخاری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۶۰ روپے، فی شمارہ -/۶ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

زیر نظر شمارے میں ایک نہایت قیمتی مضمون "علامہ اقبال اور ہم" کے عنوان سے شامل ہے۔ آج سے لگ بھگ ۲۱ سال قبل ۳/ مئی ۷۴ء کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ایچی سن کالج لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک جلسے سے خطاب کیا تھا۔ یہ خطاب چونکہ نہایت جامع اور فکر انگیز تھا لہٰذا احباب کی طرف سے تقاضا ہوا کہ اسے کتابی صورت دی جائے۔ چنانچہ بعد میں خود محترم ڈاکٹر صاحب نے اسے مرتب کر کے "علامہ اقبال اور ہم" کے عنوان سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے نزدیک علامہ محض مصورِ پاکستان ہی نہیں قافلۂ ملی کے ایک عظیم حدی خواں بھی تھے، تاہم علامہ اقبال مرحوم سے محترم ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کی اصل وجہ، جیسا کہ اکثر احباب کے علم میں ہے، ان کا فکرِ قرآنی ہے۔ قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب لوگوں کو متوجہ کرنا اور قرآن کے انقلابی فکر کی اشاعت کے ذریعے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنا یقیناً اقبال کے پیش نظر تھا، اسی حقیقت کا نہایت شدت کے ساتھ انکشاف محترم ڈاکٹر صاحب پر بھی ہوا، چنانچہ وہ اس معاملے میں اقبال کو بجا طور پر اپنا پیش رو قرار دیتے ہیں، اور یہی اقبال کے ساتھ ان کی دلچسپی کا اصل سبب ہے۔ مذکورہ بالا مضمون کے ذریعے ان تمام امور کی وضاحت نہایت عمدگی اور جامعیت کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

"علامہ اقبال اور ہم" کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ جنوری ۸۵ء تک اس کے چار ایڈیشن طبع ہو چکے تھے، لیکن پھر ایک عرصے تک یہ کتابچہ آؤٹ آف پرنٹ رہا۔ اب اسے عنقریب بہتر حسن ظاہری کے ساتھ اور بعض اہم مضامین کے اضافے کے ساتھ باقاعدہ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ جن مضامین کو اضافی طور پر اس

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

سلسلۂ تقاریر "تعارف الکتاب"

ڈاکٹر اسرار احمد

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ○

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط (البقرہ: ۲۵۳)

قرآن حکیم کا تیسرا پارہ "تلک الرسل" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں پہلے سورۃ البقرہ کی آخری چونتیس آیات شامل ہیں جو تقریباً سات رکوعوں میں منقسم ہیں اور اس کے بعد سورہ آل عمران کی اکانوے آیات شامل ہیں جو نو رکوعوں میں منقسم ہیں۔ سورۃ البقرہ کی جو آیات اس پارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں بالکل آغاز ہی میں وہ آیۂ مبارکہ بھی ہے جسے متعدد روایات کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی عظیم ترین آیت قرار دیا ہے یعنی "آیۃ الکرسی": اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط (البقرہ: ۲۵۵)

اللہ ہی معبودِ برحق ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے اور پوری کائنات کو وہی تھامے ہوئے ہے۔ اس کا علم بھی کامل ہے، اس کی قدرت بھی کامل ہے۔ یہ آیۂ مبارکہ بالخصوص توحید کی صفات کے میدان میں نہایت جامع اور بہت ہی عظمت کی حامل ہے۔ اس میں شفاعتِ باطلہ کی بھی نفی کی گئی ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط "کون ہے شفاعت کرنے والا جو اللہ کے ہاں شفاعت کر سکے، مگر اس کی اجازت سے"۔ یہ شفاعتِ حقہ ہے جو اللہ کی اجازت سے ہوتی ہے۔ اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے اپنی امت کے حق میں اور اولیاء اللہ کو بھی اللہ کے پسندیدہ بندوں کو بھی، اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور وہ شفاعت فرمائیں گے۔ لیکن یہ کہ بغیر اللہ کی مرضی کے، وہاں کسی کو بھی بولنے کا یارا نہ ہوگا۔

اس کے فوراً بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات میں سے وہ واقعہ بھی ذکر ہوا جو شہنشاہِ وقت کے دربار میں پیش آیا، جبکہ انھوں نے بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوری جرأتِ مردانہ کے ساتھ ایمان باللہ کا اعلان کیا اور توحید کا غلغلہ بلند کیا اور وہ واقعہ بھی کہ جب میں خود انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے ایمان اور یقین میں اضافہ کے لیے درخواست کی کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (البقرہ: ۲۶۰) "پروردگار دکھا مجھے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا"۔

اس کے بعد سورۃ البقرہ کے دو رکوع "انفاق فی سبیل اللہ" کی ہدایات اور احکامات پر مشتمل ہیں۔ یعنی جہاں اللہ کے دین کے لیے جسمانی محنت و مشقت کی ضرورت ہے، وہاں مال خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ لہٰذا مال خرچ کرو، بھلائی کے دوسرے کاموں میں بھی، غرباء کے لیے بھی، مساکین کے لیے بھی، لیکن اس کی جو بہت بہتر اور برتر صورت ہے وہ یہ کہ اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے، اللہ کے دین کے غلبے کے لیے، اللہ کی راہ میں مال صرف کیا جائے، اور یہ مال پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ صرف کیا جائے، اس میں ریاکاری کا کوئی پہلو شامل نہ ہونے پائے۔ اس میں جو بہتر اور انسان کو محبوب تر ہو وہ خرچ کیا جائے۔ تو دو رکوعوں میں بڑی جامعیت کے ساتھ "انفاق فی سبیل اللہ" کا ذکر ہے اور یہ درحقیقت ایک گوشہ ہے جہاد فی سبیل اللہ ہی کے حکم کا۔ اس لیے کہ جہاد کا حکم قرآن پاک میں جہاں بھی آیا وہاں اس کے دونوں پہلو بیان ہوئے: وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (الصف: ۱۱) جہاں جان سے جہاد مطلوب ہے انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو صرف کرے یہاں تک کہ اگر وقت آئے یا ضرورت درپیش ہو تو اپنی جان کا نذرانہ بھی بارگاہِ ربانی میں پیش کر دے، تو وہاں مال کا صَرف کرنا بھی دین کے غلبے کے لیے اور دین کی نشر و اشاعت کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اس کے بعد ایک حکم میں انفاق فی سبیل اللہ کے جو بالکل برعکس صفت ہے، یعنی انسان کے دل میں مال کی محبت اس درجہ پیدا ہو جائے کہ وہ سُود کے ذریعے سے انتہائی بے رحمی کے ساتھ دوسرے غریبوں کا خون چوس کر اپنی دولت میں اضافہ کرے، اس کی انتہائی شدت کے ساتھ مذمت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جن جن چیزوں سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے ان میں جس شدت کے ساتھ سود کی ممانعت وارد ہوئی ہے وہ شدت کسی اور حکم میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس لیے فرمایا گیا:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرہ: ۲۷۹) "اگر تم اس سے باز نہ آؤ تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ"۔ تمہارے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلانِ جنگ ہے۔ اس کے بعد ایک رکوع میں معاملاتِ انسانی کی درستی کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی قرض کے لین دین کا معاملہ ہو تو اس کو ضرور لکھ لیا کرو۔ اس میں معاملات کے درست ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ اس ضمن میں شہادت کا قانون بھی بیان ہو گیا۔

اس کے بعد سورۃ البقرہ کا آخری رکوع وارد ہوتا ہے جو انتہائی جامع ہے جس میں فرمایا گیا کہ:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ (البقرہ: ۲۸۵)

گویا کہ ایمانیات کا بڑی جامعیت کے ساتھ یہاں ذکر ہو گیا اور آخر میں ایک عظیم دعا پر یہ سورۃ مبارکہ ختم ہوئی ہے کہ اے ہمارے رب! ہمارا مواخذہ نہ کیجیو ان خطاؤں پر جو ہم سے بھول چوک سے سرزد ہو جائیں اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالیو جو تو ہم سے پہلی قوموں پر ڈالتا رہا ہے۔ اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالیو، جس کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو۔ اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائیو اور ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دیجیو، ہماری بخشش کیجیو اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائیو۔ یہ آخری لفظ گویا کہ تنبیہہ بن گیا کہ اب کفار کے ساتھ جہاد بالسیف اور قتال بالسیف کا دور شروع ہونے والا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کے بعد قرآنِ حکیم میں سورۂ آلِ عمران آتی ہے۔ یہ سورہ ہر اعتبار سے سورۃ البقرہ ہی کا جوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث شریف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ایک ہی نام سے موسوم کیا: "اَلزَّهْرَاوَيْن" یعنی دو انتہائی روشن سورتیں۔ اس سورۂ مبارکہ کا آغاز بھی قرآنِ مجید کی عظمت، کلامِ الٰہی کی برکت اور بالخصوص اس حقیقت کی طرف منعطف کروانے سے ہوا کہ قرآن کریم میں کچھ آیات محکم ہیں اور کچھ متشابہ۔ کچھ تو وہ ہیں کہ جن کا مفہوم بالکل واضح ہے جس میں قطعاً کسی ابہام کا شائبہ موجود نہیں اور بعض آیات ایسی ہیں کہ جن کے حقیقی اور صحیح مفہوم کے تعین میں کچھ اشتباہ پیش آسکتا ہے۔ تو جو اہلِ حق ہیں، طالبِ ہدایت ہیں وہ آیاتِ محکمات ہی کا تتبع کرتے ہیں اور ان ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں کوئی زیغ ہے، کوئی کھوٹ ہے، جو درحقیقت طالبِ ہدایت نہیں،

طالبِ ضلالت ہیں وہ آیاتِ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کے مفہوم کے تعین کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ان تمہیدی آیات کے بعد گفتگو جو ہے وہ اکثر بیشتر نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے ساتھ ہوئی یعنی سورۃ البقرہ میں اہلِ کتاب میں سے یہود کو خطاب کیا گیا اور سورۂ آل عمران میں خطاب کیا گیا نصاریٰ اور متّبعین حضرت مسیح علیہ السلام کو۔ ان سے سب سے زیادہ جو بات وضاحت کے ساتھ فرمائی گئی وہ الوہیتِ مسیح کے عقیدے کی نفی ہے۔ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا تذکرہ کیا گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور ان کی اہلیہ بھی بانجھ تھیں اور بہت ضعیف ہو چکی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بڑھاپے میں اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ اس طریقے سے اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے ہاں بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اپنے حکم سے کی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں یا ان کا الوہیت میں کوئی دخل ہے۔ اگر حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں خرقِ عادت کے طور پر حضرت یحییٰ کی ولادت سے حضرت یحییٰ کو خدا کا بیٹا نہیں بنایا گیا تو اگر بن باپ کے بیٹے کی پیدائش حضرت مریم کے ہاں ہوگئی تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید کیوں سمجھا جائے اور یہ لازم کیوں سمجھ لیا جائے کہ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ ان کے اس عقیدے کی اس پُرزور نفی کے بعد کچھ گفتگو اہلِ کتاب سے بحیثیت مجموعی بھی ہوئی جس پر یہ پارہ ختم ہوتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

علّامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اِسرار احمد

ایک تقریر جو ۳ مئی ۱۹۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور میں
ایک اجتماع منعقدہ بیادِ علامہ اقبال مرحوم میں کی گئی!

خطبۂ مسنونہ اور دُعا کے بعد:

صدرِ گرامی قدر، مہمانانِ گرامی، محترم پرنسپل صاحب، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ!

اگرچہ پاکستان کی اس مشہور درس گاہ میں اس سے قبل متعدد بار خطاب کا موقع مل چکا ہے تاہم مجھے شدید احساس ہے کہ آج کے اس اجلاس سے جو بیادِ علّامہ اقبال مرحوم منعقد ہو رہا ہے، میرا خطاب کرنا ایک غیر معمولی جرأت ہی نہیں کسی قدر نامناسب جسارت بھی ہے۔

اس کا سبب بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ میں نہ زبان و ادب کے میدان کا آدمی ہوں نہ فکر و فلسفے کا، بلکہ میری بنیادی تعلیم سائنس کی ہے اور ثانوی تربیت طبّ و علاج کی۔ جبکہ علامہ اقبال کی دو سب سے زیادہ معروف حیثیتیں یہی ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور ایک عظیم فلسفی اور مفکّر بھی۔ لہٰذا علامہ مرحوم کے بارے میں میری تقریر کچھ انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ بایں ہمہ، جب مجھے اس تقریب میں حاضر ہو کر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو مَیں نے بغیر کسی پس و پیش یا ردّ و قدح کے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان، قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے اور بالکل اَن پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ مرحوم کے ساتھ سہ گانہ و سہ گونہ رشتوں میں منسلک ہے:

ایک یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمینِ پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزیں ہیں، اس کا وجود و قیام علامہ مرحوم ہی کے تخیل و تصوّر کا رہینِ منّت ہے ——

دوسرے[۲] یہ کہ وہ عالمی ملّتِ اسلامی اور امّتِ مرحومہ جس سے ہم سب منسلک ہیں، اس دَور میں اُس کی عظمت وسطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں بھی اقبال ہے اور اس کے اِحیاء و نشأۃِ ثانیہ کا سب سے بڑا حُدی خواں بھی اقبال ہی ہے ——— تیسرے[۳] یہ کہ وہ دینِ حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں کچھ ہی پہلے حالی مرحوم نے کہا تھا:

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے!
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اس دَور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا رازداں بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روحِ باطنی اور جسدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال ہی کو حاصل ہے!

یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبال سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدیدِ ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملّتِ اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ اور تشکیلِ جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد، دونوں کا اصل مبنیٰ و مدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہیے اور میں دیکھتا ہوں کہ ملّتِ اسلامی اور دینِ حق دونوں کے اِحیاء اور نشأۃِ ثانیہ کے اس طرح قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ مرحوم کو تھا۔ یَغفِرُ اللّٰہُ لَہٗ ویرحمہٗ!!

خلاصۂ کلام یہ کہ ——— میں نہ علامہ مرحوم کی شاعری اور ان کی فصاحت و بلاغت یا قدرتِ کلام کے بارے میں کسی ماہرِ فن ناقد کی حیثیت سے کچھ عرض کرنے کا مجاز ہوں ——— نہ ان کے فکر و فلسفے پر خالص فلسفیانہ انداز میں کوئی تبصرہ کر سکتا ہوں ——— بلکہ میں مذکورہ بالا چار نسبتوں ہی کے بارے میں کچھ مختصراً عرض کروں گا:

(۱)

مصوّرِ پاکستان

سب جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے، بلکہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے مزاج کو عملی سیاست کے ساتھ ساز گار نہ بنا سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے برصغیر ہند و پاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی تدبّر کا شاہکار ہے۔ ۱۹۳۰ء سے قبل تو سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے، اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہِ دُور رس و دُور بین تھی جس نے حالات کے رُخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کی جائے!

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف "مصوّر" کا نہیں، اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اگرچہ خود عملی سیاست کے مردِ میدان نہ تھے، تاہم حالات کی صحیح نباضی اور ان کی سیاسی بصیرت کا دوسرا شاہکار یہ ہے کہ انہوں نے موجود الوقت حالات میں مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی کے لیے صحیح ترین وکیل، ڈھونڈ نکالا اور نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہِ دُور رس نے مسلمانانِ ہند کی قیادتِ عظمیٰ کے لیے محمد علی جناح مرحوم کو تاکا بلکہ خود اُن میں اپنی اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اور یہ تو بلاشبہ علامہ مرحوم کے غایتِ خلوص و اخلاص کا بیّن ثبوت اور ان کے حد درجہ انکسار اور تواضع کی دلیلِ قاطع ہے کہ انہوں نے اس قائد کے ساتھ اس کی تنظیم کے ایک صوبائی صدر کی حیثیت سے کام کرنا بھی منظور کر لیا حالانکہ ان کے مزاج کو اس قسم کے کاموں کے ساتھ کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ اس طرح علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصوّر پیش کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی

جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں بنفسِ نفیس شرکت بھی کی اور گویا 'تحریکِ پاکستان' کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اُس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیتِ قوم خود پاکستان ہی کی قدر نہ کی، علامہ کے احسان کو کیا یاد رکھتے۔ کاش کہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ مملکتِ خداداد پاکستان اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ مرحوم کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا۔

ہماری اسی ناقدری کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کا ایک بازو نہ صرف یہ کہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا بلکہ کم از کم فوری طور پر اس کی کامل قلبِ ماہیت بھی ہو گئی اور اس نے ایک اسلامی یا اس سے بھی کمتر درجے میں ایک مسلمان مملکت کے بجائے ایک لادینی، قومی، سوشلسٹ ریاست کا روپ دھار لیا۔ اس حادثۂ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح "ہزار سالہ شکست کے انتقام" سے تعبیر کیا گیا اس سے اُن لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے۔ اگر مسز اندرا گاندھی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے، یہ الفاظ زبان سے نکال سکتی ہے تو "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا" کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست متعصب مزاج ہندو اکثریت کا ردِ عمل اگر اسے ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا، تو کیا ہوتا!

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اب تک ہندوستان سے اسلام کا صفایا ہو چکا ہوتا بلکہ پورا مشرقِ وسطیٰ ہندو امپیریلزم کے سیلاب کی زد میں ہوتا۔

علامہ مرحوم نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں فرمایا تھا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تو اگرچہ شخصاً تو علامہ مرحوم کا کوئی مقابلہ یا موازنہ حضرتِ مجددؒ کے ساتھ خارج از بحث ہے، تاہم اگر یہ کہا جائے کہ خاص طور پر ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی" کے اعتبار سے علامہ مرحوم کو ایک

نسبتِ خصوصی حضرت مجدد کے ساتھ حاصل تھی یا یہ کہ علامہ مرحوم کی شخصیت کا یہ پہلو حضرت مجدد کے ساتھ ان کی والہانہ محبت اور عقیدت ہی کا مظہر ہے تو غالباً یہ غلط نہ ہوگا۔

(۲)

قافلۂ ملّی کا حُدی خواں

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کے پیشِ نظر یہ بات بڑی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے قومی مسائل کا ذکر علامہ مرحوم کے اشعار میں کہیں موجود نہیں ہے اور اپنے اشعار میں وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ کے نقیب اور قافلۂ ملّی کے حُدی خواں نظر آتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی شاعری کے دورِ اوّل میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہ صرف یہ کہ ان کا جذبۂ حُبّ الوطنی چھلکا پڑتا ہے بلکہ باقاعدہ ہندی قوم پرستی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ لیکن 'بانگِ درا' ہی کے نصفِ آخر میں دفعتہً وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ کے ترجمان و حُدی خواں کی حیثیت سے نمودار ہو جاتے ہیں اور "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اور "میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے" کی جگہ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا وجد آفریں ترانہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین ہندوستان کے مسلمانوں کے جُداگانہ قومی تشخص کا مسئلہ جو ان کے سیاسی فکر کا مرکز و محور رہے، ان کے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتا۔

میرے نزدیک یہ تصوّر پسندی (IDEALISM) اور حقیقت بینی (REALISM) کا حسین ترین امتزاج ہے جس سے ہمیں علامہ مرحوم کی شخصیت متّصف نظر آتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ یہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" اور "فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ"[1] کی عمدہ مثال ہے کہ ایک جانب فکر اور خیال انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہوں اور دوسری طرف انسان کا تعلّق اپنے نزدیکی ماحول کے تلخ حقائق سے بھی منقطع نہ ہونے پائے۔

---

[1] سورۂ ابراہیم کی ایک تمثیل سے ماخوذ: ترجمہ: اس کی جڑ جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں!"

علاّمہ مرحوم کی مِلّی شاعری میں، جیساکہ ابتدا میں عرض کیا گیا تھا، دونوں رنگ موجود ہیں، مرثیہ خوانی کا بھی اور حُدی خوانی کا بھی ــــــ پہلے اعتبار سے یُوں سمجھیے کہ انہوں نے شبلی وحالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا اور مِلّتِ اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور اُمّتِ مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت مؤثر اور دلدوز انداز میں کھینچا۔ مثال کے طور پر حالی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے　　اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اور پھر پڑھیے وہ نظم جو "صقلیہ" (جزیرہ سسلی) پر علاّمہ مرحوم نے کہی اور اندازہ کیجئے اقبال کی مِلّی مرثیہ خوانی کا!

رو لے اب دِل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار!　　وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی　　بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے　　بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اِک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور　　کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا　　آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یا پڑھیے 'بانگِ درا' میں اس کے قریب ہی کی وہ نظم جو "بلادِ اسلامیہ" کی یاد میں کہی گئی۔ اور جس میں دِلّی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ ایسے عروس ہائے بلاد میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر انتہائی رقّت انگیز پیرائے میں اُمّتِ مسلمہ کی عظمتِ گزشتہ وسطوتِ پارینہ کا مرثیہ پڑھا گیا۔

یا پڑھیے علاّمہ اقبال کی وہ طویل نظم جو "مسجدِ قرطبہ" کے عنوان سے 'بالِ جبریل' میں شامل ہے۔ اس میں فکر و خیال کی عام بلند پروازی کے علاوہ جذبۂ مِلّی کی جو بے قراری از ابتدا تا انتہا جاری وساری

ہے اس سے بھی قطع نظر صرف وہ اشعار پڑھیے جو براہِ راست مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہے گئے ہیں، اور اندازہ کیجیے جذباتِ ملّی کے اس طوفان کا جو اس "کافرِ ہندی" کے قلب میں موجزن تھا!! اور غور کیجیے اس کے دو آخری بندوں پر کہ کس خوبصورتی کے ساتھ امّتِ مرحومہ کی تجدید و احیاء کا پیغام دیا گیا اور کیسے جذبہ پرور انداز میں ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی دعوت دی گئی۔

اور یہی دراصل علامہ مرحوم کی ملّی شاعری کا وہ مثبت اور تعمیری پہلو ہے جو انہیں ملّت کے سابق مرثیہ خوانوں سے ممتاز اور ممیّز کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ علامہ کے یہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں انتہائی ولولہ انگیز پیغامِ عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی ہے جس نے یاس اور قنوطیت کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا اور دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیئے۔

یوں تو علامہ کے اشعار میں یہ امید افزا پیغام گویا رچا بسا ہوا ہے، چنانچہ بانگِ درا کے متوسط حصے میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے کہ:

؎ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور

؎ اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

لیکن خاص طور پر "طلوعِ اسلام" تو گویا از اوّل تا آخر ایک "طبلِ رحیل" ہے:۔

؎ سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور ؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علّامہ مرحوم کی یہ مِلّی شاعری، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، حدودِ ارضی سے بالکل آزاد ہے اور ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطّۂ ارضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور کرتا ہوگا۔ گویا ان کی شاعری "وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ"[1] کے ہر شائبے سے بالکل پاک ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ:۔

طہران[2] ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

لیکن دوسری طرف اپنے گردوپیش سے بھی بے خبر نہیں ہے بلکہ حالات کی نبض پر ہاتھ دھرے مسلمانانِ ہند کے مسائل کی تشخیص بھی کر رہا ہے اور ان کا حل بھی پیش کر رہا ہے!

ملّتِ اسلامیہ کی تجدید اور اُمّتِ مرحومہ کی نشأۃِ ثانیہ کی جو فوری امّید علّامہ کو تھی، محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے آخری دَور میں اسے بہت سے صدموں سے دوچار ہونا پڑا اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بعد میں ایک قسم کی ناامّیدی اور یاس کی سی کیفیت بھی علّامہ مرحوم پر طاری ہو گئی تھی، جو مثلاً اس قسم کے اشعار سے ظاہر ہے کہ:

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

اور

---

[1] سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۶ کا ایک ٹکڑا۔ ترجمہ: "لیکن وہ تو زمین کی جانب ہی جھکتا چلا گیا!"

[2] یہ دُوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت طہران کی بجائے ارضِ لاہور کو عطا فرما دی جہاں ملّتِ اسلامیہ کا یہ حُدی خواں مدفون ہے۔ ابھی جو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کے موقع پر جناب وقار انبالوی نے علّامہ مرحوم کی روح سے خطاب کر کے کیا خوب کہا ؎

اے دیدۂ بیدارِ خودی! مردِ قلندر!
رحمت ہے خدا کی ترے افکارِ مبیں پر

لاہور بنا ہے تری ملّت کا جنیوا
کیا رنگِ بہاراں ہے گلستانِ یقیں پر

تعبیر سے ہم دوش ہے اقبال ترا خواب
مسرور ہو تو خلد میں جمعیتِ دیں پر

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج' دیکھ چکا صدف صدف!

لیکن اس کا اصل سبب یہ ہے کہ علامہ مرحوم نابغہ (GENIUS) اشخاص میں سے تھے' جن کے بارے میں یہ مسلّم ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے زمانے سے قدرے بعد کی باتیں کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں تیس چالیس سال کا عرصہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ علامہ مرحوم نے جس دور کا خواب دیکھا تھا اس کی ابتدا ہو رہی ہے[1]۔

---

[1] (ب ۔ ن ۔ نومبر ۹۴ء) یہ بات راقم نے ۴ مئی ۱۹۷۳ء کو کہی تھی اور بحمد اللہ ایک سال سے کم مدت کے اندر اندر اس کی دو عظیم شہادتیں بھی رونما ہو گئی تھیں ۔ چنانچہ ایک[1] طرف اکتوبر ۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں ایک بالکل نیا نقشہ دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ چنانچہ وہی عرب جو بزدل اور بھگوڑے مشہور ہو گئے تھے' ان کی بہادری' جرأت اور جانبازی کے چرچے عام ہو گئے اور وہ عالمِ عرب جس کا اختلاف وافتراق ضرب المثل بن چکا تھا دفعتاً ایک متحد قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آن کھڑا ہوا ——— یہاں تک کہ یہ "کنجشکِ فرومایہ" تیل کا ہتھیار استعمال کر کے امریکہ ایسے "شاہین" سے لڑ گیا! دوسری[2] طرف فروری ۷۴ء کی عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور نے عالمِ اسلام کے اتحاد کا ایک نہایت دلفزا منظر چشمِ عالم کے سامنے پیش کر دیا جس کی اہمیت کا اصل اندازہ اس سراسیمگی سے لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت بھارت اور اس کے کارپردازوں پر طاری ہو گئی تھی۔

یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اقبال ہی کے ان اشعار کے مصداق کہ "دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح وبدن پیش۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا!" اور "اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!" دنیا کی ابلیسی قوتوں نے احیاءِ دین وملّت کی اس چڑھتی لہر کو نہ صرف روک دیا بلکہ پسپائی پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس کے بعد سے اب تک یہ لہر اتار اور چڑھاؤ کے کئی ادوار سے گزر کر بہرحال اس حد تک آگے بڑھ آئی ہے کہ پوری مغربی دنیا "مسلم فنڈامنٹلزم" سے خائف نظر آتی ہے۔ اور اگرچہ ابھی احیاءِ دین وملّت کا یہ عمل مستقبل قریب میں بعض بڑے بڑے صدمات سے دوچار نظر آتا ہے تاہم بالآخر جو نویدِ جانفزا اقبال نے دی تھی وہ الفاظِ قرآنی "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" اور احادیثِ نبویہؐ میں واردشدہ پیشینگوئیوں کے مطابق لازماً پوری ہو کر رہے گی۔ اور ع "بتا رہی ہے یہ ظلمت شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے!" کے مصداق حوادث وواقعاتِ عالم کی تیز رفتاری بتا رہی ہے کہ بالآخر پورے کرۂ ارضی پر "خلافت علیٰ منہاج النبوت" کے نظام کا قیام اب بہت زیادہ دور نہیں ہے!

(ڈاکٹر اسرار احمد ۸ نومبر ۹۴ء)

(۳)

رُومیٔ ثانی

جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارفِ ایمانی اور علم و حکمتِ قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم رومیٔ ثانی تھے! انہوں نے علی الاعلان مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا ہے اور "پیرِ رومی" کے ساتھ بحیثیت "مریدِ ہندی" ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر قدرے فخریہ انداز میں بھی کیا ہے یعنی ع

"برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است!" (۱)

اب اگر مثنویٔ مولانا روم کے بارے میں عارف جامی کے یہ اشعار مبنی برحقیقت ہیں کہ:

مثنویٔ مولویٔ معنوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی (۲)

من چہ گویم وصفِ آں عالیجناب نیست پیغمبر ولے دارد کتاب (۳)

تو یقیناً علامہ اقبال مرحوم بھی دورِ حاضر کے "ترجمان القرآن" قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

علامہ مرحوم خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ ان کے اشعار فکر و پیغام قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتماد ہے کہ انہوں نے مثنوی اسرار و رموز کے آخر میں "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ" کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است (۴)

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را زخارم پاک کن (۵)

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!

بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا! (۶)

آخری مصرع کو پڑھ کر ہر وہ شخص کانپ اٹھتا ہے جسے کسی بھی درجے میں علامہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اندازہ ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں نے جب بھی یہ اشعار پڑھے ایک مرتبہ ضرور جھرجھری سی آگئی اور دل لرز اٹھا کہ اللہ اکبر! اپنے حق میں اتنی بڑی بددعا! لیکن پھر اس خیال سے تسکین ہوتی رہی کہ دراصل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو کس

درجہ پختہ یقین تھا اس بات پر کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے [۱]۔

۱۔ رُوحِ دین کی تشریح و تعبیر

جہاں تک روحِ دین کی تشریح و تعبیر کا تعلق ہے علامہ مرحوم کی خدمات کو منفی و مثبت دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ——— چنانچہ ایک طرف انہوں نے بنیادی اعتقادات اور اساسی فکر کے ضمن میں ہمہ اوستی نظریات اور شیخ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی عامیانہ تعبیرات کی پُرزور تردید کی اور جواباً وہ نظریہ پیش کیا جو اقبال کے فلسفۂ خودی کے نام سے موسوم ہے اور اصلاً حضرت مجددؒ کے نظریۂ وحدت الشہود سے مشابہ ہے ——— اور دوسری طرف عبادات کے میدان میں نری رسم پرستی (RITUALISM) کی زور دار نفی کی اور اثباتاً عبادت کی اصل رُوح یعنی عشق و محبتِ خداوندی پر زور دیا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک ہمہ اوست کی مختلف تعبیروں کے مابین فرق یا ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی باریکیوں کا تعلق ہے، ان کی وضاحت کا یہ مناسب موقع ہے

---

[۱] یہاں راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چند سال قبل جب مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ آنکھ کے آپریشن کے لیے لاہور میں مقیم تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی تو فرصت کے اس وقت کا مصرف مولانا نے یہ نکالا کہ علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ لاہور کے تمام رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر طویل عرصے تک ایک خاص کیفیت مولانا پر طاری رہی اور حسبِ عادت مولانا نے اپنے تاثر کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا کے تاثر کی شدت کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل دو جملوں سے لگایا جاسکتا ہے جو راقم الحروف کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:

ایک یہ کہ "قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!" دوسرے یہ کہ "اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اس اُمت میں پیدا ہوا لیکن یہ اُمت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہوگا!" (اسرار احمد)

نہ ہی میں اس کا اہل ہوں اور نہ ہی اس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسائل بہت دقیق ہیں اور ان کا سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اصل خرابی اس طرح واقع ہوئی کہ ان نظریات کا پرچار اشعار کے ذریعے کیا گیا جو زبان زدِ خواص و عوام ہو گئے۔ اب خواص نے تو انہیں ہضم بھی کر لیا اور رچا پچا کر جزوِ بدن بھی بنا لیا لیکن عوام کے لیے یہ زہرِ ہلاہل بن گئے اور انہوں نے ان کو عمل سے گریز اور فرار کا بہانہ بنا لیا۔

اقبال کا جہاد اصلاً ان نظریات کے اُن عمومی اثرات ہی کے خلاف ہے جو حافظؔ اور جامیؔ کے اشعار کے ذریعے عوام کے اذہان پر مترتّب ہوئے اور جن کے نتیجے میں اُمت کے ایک بڑے حصے میں سُکر، جذب، مستی اور بالآخر فنا کا ذوق تو پیدا ہو گیا لیکن عمل اور جہاد کا جذبہ ختم ہوتا چلا گیا۔

فلسفۂ خودی

بدقسمتی سے علامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی نے مختلف بلکہ متضاد تشریحوں اور تعبیروں کے باعث ایک چیستاں کی صورت اختیار کر لی ہے اور معاملہ بالکل وہی ہوا ہے کہ

ع "شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا!"

آسان تفہیم کے لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کے فلسفے کا بنیادی پتھر انسان کی ہستی کی نفی کے بجائے اثباتِ ذاتِ خویش ہے۔ نتیجتاً ان کے پیشِ نظر سلوک، کی انتہائی منزل "فنا فی اللہ" نہیں بلکہ "بقا باللہ" ہے۔

اس نکتے کی وضاحت کے لیے اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے میں خود علامہ مرحوم کی اس تحریر کے بعض حصے آپ کو سناتا ہوں جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی اس فرمائش پر کہ علامہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبانِ انگریزی تحریر کر دیں، سپردِ قلم کی تھی اور جسے پروفیسر موصوف نے 'مثنوی اسرارِ خودی' کے ترجمے (SECRETS OF THE SELF) کے شروع میں شائع بھی کر دیا تھا (مطبوعہ ۱۹۲۱ء)۔ اپنی اس تحریر میں علامہ فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں میرا یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور اربابِ وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے، جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی کو مٹا دے ——— میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی

ہستی کو قائم رکھے . . . قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے[1] . . . میں نے افلاطون کے فلسفے پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں . . . ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادّہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنالے، اس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبے کو پہنچ جائے گا[2] . . ."

میں اگر اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کروں تو وہ یوں ہوگی کہ اس پورے سلسلۂ کائناتِ مادّی اور تمام عالمِ کون و مکان کی طرح خود انسان کا مادّی وجود یا اس کا وجودِ حیوانی بھی خالص وہمی و خیالی اور اعتباری محض ہے، سوائے اس کی انا یا من یا ذات یا خودی کے جو دراصل عبارت ہے اس کی اس رُوح سے جو اس کے وجودِ حیوانی میں پھونکی گئی اور جس کی اضافت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی طرف کی ہے بلفظہٖ آیۂ قرآنی: "فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ"[3] یعنی جب میں اس کو پوری طرح درست کر دوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں! ——— یہ روحِ انسانی نہ وہمی و خیالی ہے نہ عارضی و فانی بلکہ حقیقی اور واقعی بھی ہے اور دائم و باقی بھی! خدایا روحِ کائنات یا انائے کبیر اور اس روحِ انسانی یا انائے صغیر میں ایسا قریبی رابطہ اور لازم و ملزوم کا رشتہ ہے کہ انسان اسے

---

[1] یہاں علامہ مرحوم نے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" کا حوالہ بطور حدیثِ رسولؐ دیا ہے لیکن اصلاً یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں بلکہ صوفیا کے ایک مشہور مقولے کے ہیں!

[2] غالباً یہی مفہوم ہے علامہ مرحوم کے اس مشہور مصرع کا کہ ع یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

[3] یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

[4] سورۃ الحجر آیت ۲۹ اور سورۃ ص آیت ۷۲

پہچان لے تو خدا کو جان جاتا ہے[1] اور اگر اسے نہ پہچان پائے تو کبھی خدا کی معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یا عکساً یوں کہہ لیں کہ اگر کوئی خدا کو پہچان لے تو اپنی عظمت سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر خدا کو بھلا دے تو اپنی حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے[2]۔

خالق و مخلوق اور عبد و معبود یا اناے کبیر اور اناے صغیر یا علامہ کے الفاظ میں اناے مطلق (INFINITE EGO) اور اناے محدود (FINITE EGO) کے مابین اصل رشتہ باہمی عشق اور محبت کا ہے بفحوائے آیاتِ قرآنی:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ	اور (حقیقی) ایمان والے سب سے زیادہ
حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ: ۱۶۶)	شدید محبت کرتے ہیں خدا کے ساتھ!
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ	یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے[3] اُن لوگوں سے
فِيْ سَبِيْلِهٖ (الصّف: ۵)	جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں ....

اور اسی باہمی رشتۂ الفت و محبت کا مظہرِ خارجی ہے جسے قرآن "ولایتِ باہمی" سے تعبیر کرتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرۃ: ۲۵۸)	اللہ اہلِ ایمان کا ولی ہے۔
اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ	آگاہ ہو جاؤ اللہ کے ولیوں کے لیے نہ کوئی
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲)	خوف ہے نہ حزن!

اب ظاہر ہے کہ جس کسی کو اس عشق کی حقیقی لذت حاصل ہو گئی وہ اس کے دوام و بقا کا خواہشمند ہو گا نہ کہ اس کے انقطاع اور خاتمے کا! اور ظاہر ہے کہ بقاے عشق بقاے ذات پر منحصر ہے اور

---

[1] یہ ترجمہ ہے صوفیاء کے اس مقولے کا جو عموماً حدیثِ رسول کی حیثیت سے بیان کر دیا جاتا ہے یعنی:
"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ"

[2] یہ ترجمہ ہے آیۂ قرآنی کا "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝" (سورۃ الحشر آیت ۱۹)

[3] اس آیۂ کریمہ کو پڑھتے ہوئے میرا ذہن علامہ مرحوم کے اس شعر کی جانب لازماً منتقل ہو جاتا ہے کہ ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اوّلیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بکدۂ تصورات!

اور ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام — میرا سجود بھی حجاب! میرا قیام بھی حجاب!

اور فریاد کی کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یا رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

اس لیے کہ جملہ اعمال کی روح عشقِ الٰہی ہے۔ اسی کی لپک بلالؓ کی اذان میں تھی اور اسی کی دمک تلقینِ غزالیؒ میں! بقول علامہ مرحوم: ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات! — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات!

اور ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق! — معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق!

۲۔ نظامِ دین کی توضیح و تفسیر

نظامِ دینِ حق کی جو تشریح علامہ مرحوم کے کلام میں نظر آتی ہے اُسے بغرضِ تفہیم تین اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اور یہ تینوں درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے کی شرح اور ایک ہی نقطۂ توحید کی توسیع (Extension) کی حیثیت رکھتے ہیں:

ع "یہ سب کیا ہیں بہ فقطِ اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!"

(ا) مثلاً عام تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدتِ خالق ہی وہ اساسی تصوّر ہے جس سے وحدتِ انسانیت کا خیال جنم لیتا ہے اور جس میں مزید گہرائی و گیرائی وحدتِ آدم کے تصوّر سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجۃً انسانی حرّیت، اخوّت اور مساوات کے اصول مستنبط ہوتے ہیں؛ چنانچہ نظامِ دینِ حق کے اس پہلو پر بہت زور علامہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ میں اس وقت طوالت کے خوف سے ان دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

مردِ مومن کی شان میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں :-

کُلُّ مُؤمِنٍ اِخوَۃٌ اندر دِلش حُریت سرمایۂ آب و گِلش (۱۲)

ناشکیبِ امتیازات آمدہ در نہادِ اُو مساوات آمدہ (۱۳)

(ب) اسی طرح ہیئتِ سیاسی کے ضمن میں توحیدِ الٰہی ہی کے اصلُ الاصول سے مستنبط ہوتا ہے یہ اساسی قاعدہ کہ حاکمیت صرف خدا کے لیے ہے، ماسویٰ کی حاکمیت پر مبنی نظامِ سیاسی مجسّم شرک ہے۔ غور کیجیے کہ کتنے سادہ لیکن پرشکوہ الفاظ میں ادا فرمایا ہے علامہ مرحوم نے یہ قاعدہ کلیہ :-

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

کسی ہیئتِ سیاسی میں تصوّرِ حاکمیّت کے بعد سب سے اہم مسئلہ "امرِ جامع" کا ہے یعنی یہ کہ اُس ہیئتِ سیاسی میں شریک افراد کو باہم ایک دوسرے سے جوڑنے والی چیز کون سی ہے! اس ضمن میں اس زمانے میں وطنی قومیّت کا جو تصوّر پوری دنیا میں رائج ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم نے اس کی شناعت کا احساس کس شدّت سے کیا اور اس شجرِ خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا۔ سنیئے اور سر دُھنیے :-

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اَور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

(ج) یہی معاملہ نظامِ معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصول جس طرح حاکمیّت اور قومیّت کے تمام مرّوجہ تصورات کی نفیِ کلّی ہے، اسی طرح ملکیّتِ مطلقہ کے عام تصوّر کی بھی کامل نفی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر "مُلک" اللہ کا ہے تو "مِلک" بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس

سب کا "مَلِک" (بادشاہ) اللہ ہے تو یقیناً "مالک" بھی اللہ ہی ہے۔

گویا انسان خود بھی اللہ کا ہے (اِنَّا لِلّٰہِ) اور جو کچھ اس کے پاس ہے، خواہ وہ اس کی اپنی ذات اور اس میں مخفی قوتیں، صلاحیتیں اور اس کی مہلتِ عمر ہوں، خواہ اس کا مال و اسباب یا زمین و جائیداد سب اصلاً اللہ کی ملکیت ہیں اور اس کے پاس اللہ کی امانت جس میں تصرّف کا اختیار تو اسے دیا گیا ہے لیکن اصل مالک کے احکام کے اندر اندر۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں۔ بقول شیخ سعدیؒ: ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خداست (۱۴)

افسوس کہ جب دینِ الٰہی کے چہرے پر از منۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام کی نقاب پڑ گئی تو اس کے رُوئے منوّر کے دُوسرے خدّوخال کی طرح یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور یہ علامہ مرحوم کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا شاہکار ہے کہ انہوں نے نکتۂ توحید کی اس لازمی توسیع (EXTENSION) کو بھی حد درجہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا: ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھری موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

نہ صرف یہ بلکہ مرحوم نے اس اصول کو بھی بہت وضاحت کے ساتھ پیش فرما دیا جو تاریخ انسانی کے دوران پہلی بار خلافتِ راشدہ کے زمانے میں حضرت عمرؓ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا تھا، یعنی ریاست کی جانب سے تمام شہریوں کی کفالتِ عامّہ۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس ! (۱۵)

اور ؎

جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !

اس سلسلے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں علامہ مرحوم کے یہ اشعار :

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ ! (۱۶)
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو ! — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا (۱۷)
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! — کس نداند لذتِ قرضِ حسن (۱۸)
از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ — آدمی درندہ بے دندان و چنگ (۱۹)
رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست — ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست (۲۰)
بندۂ مومن امیں، حق مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است (۲۱)
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں (۲۲)

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃ" (۲۳)

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (۲۴)
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ (۲۵)

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
سازِ قرآں را نواہا باقی است[1] (۲۶)

---

[1] اشارہ ہے اس حدیث نبویؐ کی طرف جس میں خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ باقی نہ رہے گا۔

(رواہ البیہقی عن علیؓ)

(۴)

اقبال اور قرآن

اب میں اس چوتھی اور آخری بات کے بارے میں کچھ عرض کر کے اپنی گزارشات ختم کر دوں گا جس کے ضمن میں میں نے ابتداء میں یہ عرض کیا تھا کہ میرا گمان ہے کہ مجھے علامہ مرحوم کی روح سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے ـــــ یعنی مرحوم کا تعلق قرآنِ حکیم سے اس موضوع کا اہم ترین حصہ تو پہلے ہی زیرِ بحث آچکا ہے یعنی یہ کہ علامہ مرحوم کی حیثیت فی الواقع "ترجمان القرآن" کی ہے اور جیسا کہ خود اُن کا دعویٰ ہے ان کا فکر بھی قرآن ہی پر مبنی ہے اور ان کا پیغام بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے لہٰذا اب میں اس موضوع کے بعض ضمنی مگر نہایت اہم پہلوؤں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کراؤں گا

۱: عظمتِ قرآن کا نشان

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور میں علامہ مرحوم کی شخصیت عظمتِ قرآن کے ایک عظیم علَم اور نشان (SYMBOL) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عام آدمی کا متوارث عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے، اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق و اعتماد اور ایمان و یقین جو فکرِ انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم پھر چکا ہو اور مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو، بالکل دوسری بات ہے۔

سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل اور عظیم ترین معجزہ قرآنِ حکیم ہے۔ اب خود اعجازِ قرآنی کے پہلو بے شمار اور بے حد و نہایت ہیں جن کا احاطہ یا احصاء کسی فردِ بشر کے لیے ممکن نہیں۔ اور میرے نزدیک اس دَور میں اعجازِ قرآنی کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل عرب کے ایک اُمّی شخص (صلی اللہ علیہ وسلم و فداہ ابی و امی) نے پیش کیا تھا آج بھی جبکہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، مادّی علوم انتہائی بلندی کو چھُو رہے ہیں اور علم و ہُنر کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے، نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے!

اور اسی کی ایک گواہی اور شہادت ملتی ہے علامہ مرحوم کی زندگی سے کہ ایک شخص جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں شعور کی آنکھ کھولی۔ پھر یہ نہیں کہ پوری زندگی "بسم اللہ کے گنبد" ہی

میں بسر کر دی ہو بلکہ وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا، مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھے، قدیم و جدید سب کا مطالعہ کیا ——— لیکن بالآخر اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے، اور اس کی علم کی پیاس کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے، گویا بقول خود ان کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

کیا اس دور میں قرآن حکیم کے "ھُدًی لِّلنّاس" ہونے کے لیے کسی اور دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ اور کیا یہ کافی ثبوت نہیں ہے اس کا کہ قرآن ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے انسان کی فکری رہنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے؟

۲: واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن

اور اسی کا ایک عکس سمجھیے اس حقیقت کو کہ اس دور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف بھی جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا، شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو! اس لیے کہ عظمتِ قرآنی کا انکشاف بہرحال کسی شخص پر اس کے اپنے ظرفِ ذہنی کی وسعت اور عُمق کی نسبت ہی سے ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ع "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" کے مصداق وہ فی الواقع جمال و جلالِ قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں، دید پر مبنی ہے، بلکہ ایسے لگتا ہے جیسے ان کا پورا وجود کلامِ پاک کی عظمت کے بارِ گراں سے "خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا" ہوا جا رہا ہے، عظمتِ قرآنی کا احساس و ادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور ان کا ہر بُنِ مُو قرآن کی جلالت قدر اور رفعتِ شان کے ترانے گا رہا ہے۔ ذرا گوشِ ہوش سے سنیے: ؎

آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم (۲۷)
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات (۲۸)
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے — آیۂ اش شرمندۂ تاویل نے (۲۹)
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو رحمۃٌ لِّلعٰلمیں (۳۰)

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند[1] از کتابے صاحبِ دفتر شدند (۳۱)

آنکہ دوشش کوہ بارش برنتافت سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت (۳۲)

اور سوچیے کہ کیا اس کلام میں دُور دُور بھی کسی آورد کا سراغ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آمد ہی آمد ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ قائل کا قول نہیں، حال ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی اعلیٰ مثال ہے۔

اور اسی پہ بس نہیں، آگے بڑھیے اور سنیے:

؎ فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است (۳۳)

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں زندہ و پائندہ و گویا ست ایں (۳۴)

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست (۳۵)

بات کتنی سیدھی اور سادہ معلوم ہوتی ہے، قرآن عام معروف معنوں میں کتاب نہیں یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام خود متکلم کی صفت اور اس کی جملہ صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مثلِ ذاتِ باری تعالیٰ 'ظاہر' بھی ہے اور 'باطن' بھی اور 'زندہ' بھی ہے 'قائم و دائم' بھی۔ پھر نہ ذاتِ باری زمان و مکان کی مقید ہے نہ کلام الٰہی ان کا پابند، بلکہ جیسے خود اللہ تعالیٰ 'اوّل' بھی ہے اور 'آخر' بھی اور زمان و مکان کُل کے کُل وجودِ باری میں "گم" ہیں، اسی طرح کلام الٰہی کے بھی "صید زبوں" کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح اللہ کی شان یہ ہے کہ "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" اسی طرح قرآن حکیم بھی ہر دور کے افق پر ایک خورشیدِ تازہ کے مانند طلوع ہوتا رہے گا! لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم میرے محدود علم اور مطالعے میں قرآن حکیم کی اس سے زیادہ مدح و ستائش ہماری پوری تاریخ میں موجود نہیں۔! اب ظاہر ہے کہ تعریف معرفت کی مناسبت ہی سے کی جا سکتی ہے۔ بس اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ عظمتِ قرآنی کے کتنے بڑے عارف تھے علامہ اقبال مرحوم!

اور یہیں سے سمجھ میں آ سکتی ہے یہ بات کہ کیوں اس قدر دُکھ تھا علامہ مرحوم کو اُمت کی قرآن مجید کی جانب عدمِ توجہ کی روش سے، جس کا مرثیہ ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے، اور کیوں ان کا

---

[1] جس کی سب سے تابندہ مثال حضرت ابوذر غفاری ہیں، رضی اللہ عنہ!

دلِ حسّاس خون کے آنسو روتا ہے اس پر کہ مسلمانوں کو، عام اس سے کہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، قرآن سے نہ اعتنا رہے نہ دلچسپی! غور فرمایئے کہ کتنی تلخی ہے علّامہ کے اس شعر میں کہ: ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست!
کہ از یاسین او آساں بمیری!! (۳۶)

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے علّامہ مرحوم نے اُمّتِ مسلمہ کے مختلف طبقات کا: ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست — از شرابِ نغمۂ قوّال مست! (۳۷)
آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش (۳۸)
واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند — معنیٔ او پست و حرفِ او بلند (۳۹)
از خطیب و دلیمی گفتارِ او — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او (۴۰)

رہے "فقیہانِ حرم" تو ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ: ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

لہٰذا اب عوام کا تو کہنا ہی کیا، وہ غریب تو ہیں ہی "کشتۂ ملّائی و سلطانی و پیری!" ان کی عظیم اکثریت بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی، اور بقول علّامہ مرحوم ؎

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب! — العجب، ثمّ العجب، ثمّ العجب! (۴۱)

اور ظاہر ہے کہ یہاں طلب سے مراد تعمیرِ خودی کی طلب بھی ہے اور غلبۂ حق کی آرزو بھی، اس لیے کہ فی زمانہ یہی دونوں نایاب ہیں اور انہی کا حال یہ ہے کہ: ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

رہی دنیوی آرزوؤں اور طولِ امل کا جال تو اس میں تو ہر شخص ہی ع "کہ ہم تم اسیرِ کمندِ ہوا" کے مصداق بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔

ملّتِ اسلامی کے اس حالِ زبوں کے بارے میں علّامہ فرماتے ہیں:

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است — ملّت اندر خاکِ او آسودہ است (۴۲)

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد! (۴۳)

۳: داعی اِلی القرآن

علاّمہ مرحوم کے نزدیک قرآن سے یہی دُوری اور کتابِ الٰہی سے یہی بُعد اصل سبب ہے مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور اُمتِ مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلّت و خواری کا! 'جوابِ شکوہ' میں جو بات انہوں نے حد درجہ سادہ الفاظ میں فرمائی تھی کہ:-

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہوکر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

بعد میں اُس کا اعادہ نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا کہ:

خوار از مہجوریِ[1] قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی (۴۴)

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ (۴۵)

اور اب اُن کے نزدیک اسی "کتابِ زندہ" سے وابستہ ہے ان کا 'احیا' اور اسی پر دار و مدار ہے ان کی نشأۃِ ثانیہ کا! گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار ہے ان کے از سرِ نو حقیقتاً مسلمان ہونے پر اور ان کے مسلمان ہونے کا دار و مدار ہے قرآن حکیم پر ــــــ یا یُوں کہہ لیں کہ ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ وابستہ ہے 'احیائے اسلام' سے اور احیائے اسلام وابستہ ہے 'احیائے قرآن' سے جو عبارت ہے مسلمانوں کے اس کے ساتھ صحیح تعلق کی از سرِ نو استواری سے! علامہ فرماتے ہیں:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زندانِ تو! (۴۶)

قطع کردی امرِ خود را در زُبُر جادہ پیمائی اِلیٰ شَیْءٍ نُّکُر (۴۷)

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن (۴۸)

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب

تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب (۴۹)

علاّمہ کے نزدیک علم ہے تو صرف علمِ قرآنی اور حکمت ہے تو صرف حکمتِ قرآنی اور یہی

---

[1] مہجوری کا لفظ استعمال کرکے علامہ قاری کے ذہن کو قرآن مجید کی اس آیت کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں:-

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (الفرقان آیت ۳۰)

علم و حکمتِ قرآن ہے جو اگر کسی کے ذہن میں سرایت کر جائے اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو منتج ہوتا ہے ظاہر کے انقلاب پر اور یہی وہ عمل ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے کہ:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شُد، جہاں دیگر شود (۵۰)

اور کس خوبصورتی سے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاؤ:

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ایں جہاں اندر برِ اُو چوں قباست! (۵۱)
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش (۵۲)
یک جہانے عصر حاضر را بس است! — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است! (۵۳)

اور کہیں للکارتے اور غیرت دلاتے ہیں کہ:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم — تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم؟ (۵۴)
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کُن — نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کُن! (۵۵)

علامہ کے نزدیک تطہیرِ ذہن اور تعمیرِ فکر کا واحد ذریعہ تو یہ ہے ہی کہ "اسرارِ دیں" فاش کیے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے "نکتہ ہائے شرعِ مبیں" کی وضاحت کی جائے، خود تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا کارگر اور مؤثر ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است (۵۶)
خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی (۵۷)

اور

جز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است (۵۸)
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جُز بذکر (۵۹)

لیکن یہ ذکر صرف زبان سے ہی نہیں پورے وجود سے ہونا چاہیے:

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب — کارِ جاں است ایں نہ کارِ کام و لب (۶۰)

الغرض علامہ کے نزدیک اُمّت کے جملہ امراض کے لیے نسخۂ شفا بھی قرآن حکیم ہے اور ملت کے تن مردہ میں از سرِ نو جان ڈالنے کے لیے آبِ حیات بھی چشمۂ قرآنی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات (۶۱)
می دہد مارا پیامِ لَا تَخَفْ — می رساند بر مقامِ لَا تَخَفْ (۶۲)
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرح رمزِ صِبْغَۃَ اللّٰہ گفتہ ام (۶۳)
فکرِ من گر دوں مسیر از فیضِ اوست — جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست (۶۴)

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام! (۶۵)

اور

از یک آئینی مسلماں زندہ است — پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است! (۶۶)
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست — اعتصامش کن کہ حَبْلُ اللّٰہ اوست (۶۷)

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو!
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو! (۶۸)

گویا احیائے دین کی جدّوجہد ہو یا تجدیدِ ملت کی سعی، علامہ مرحوم کے نزدیک اس کا مرکز و محور ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ ہے قرآنِ حکیم، اور یہی معنی ہیں قرآنِ حکیم کی اس آیت کے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ کار اور منہجِ انقلاب کی وضاحت کے ضمن میں معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مقامات پر وارد ہوئی ہے یعنی: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اور یہی ہے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کرنے کا وہ اصل کام[1] جس پر ایک طویل عرصے تک اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر میری نگاہ جم گئی ہے کہ "جا ایں جا است"!

---

[1] یہ دراصل نام ہے میرے ایک کتابچے کا جو میری اُس تحریر پر مشتمل ہے جو میں نے جون ۶۷ء میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آخر میں، میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا اور ساتھ ہی آپ سب کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان گزارشات کو صبر اور سکون کے ساتھ سنا۔ خود میں نے جو محنت اس سلسلے میں کی ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے بقا و استحکام، ملتِ اسلامی کی تجدید و نشاۃِ ثانیہ اور دینِ حق کے احیاء و اظہار[1] ایسے اہم اور جلیل مقاصد کے ضمن میں علامہ اقبال کے فکر اور پیغام کی اشاعت کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی عوام میں بالعموم اور نوجوان نسل میں بالخصوص جو بُعد رفتہ رفتہ علامہ مرحوم کی شخصیت اور افکار و نظریات سے پیدا ہوتا جا رہا ہے، حالات کا ایک شدید تقاضا ہے کہ اسے کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ چاہیں تو اسے "احیائے اقبال" کا نام دے لیں۔ بہرحال یہ وقت کی ایک اہم ضرورت اور اسی کی ایک حقیر سی سعی ہے جو میں نے کلامِ اقبال سے یہ مواد جمع کر کے مرتّب صورت میں آپ کے سامنے پیش کر کے کی ہے۔

اب اگر میری ان گزارشات سے آپ میں سے کسی ایک کے دل میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو جائے اور ایک عزمِ مصمّم پیدا ہو جائے کہ وہ قرآن ہاتھ میں لے کر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو، تب تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت پُوری طرح پھل ہو گئی اور گویا "شادم از زندگی، خویش کہ کارے کردم!" اور اگر بدرجۂ ادنیٰ میری ان گزارشات سے آپ حضرات کے دلوں میں کلامِ اقبال کے مطالعے ہی کا شوق بیدار ہو جائے تب بھی میں یہ جانوں گا کہ میری محنت کم از کم ضائع نہ ہوئی۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

'میثاق' کے صفحات میں لکھی تھی اور جو میری موجودہ سرگرمیوں کے لیے بمنزلۂ اساس ہے۔ اس کے اب تک آٹھ ایڈیشن "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ برادر عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ نے کیا ہے، جسے مکتبۂ انجمن نے شائع کیا ہے۔ (اسرار احمد)

[1] هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصّف: ۹)

ضمیمہ

اُردو ترجمہ اشعارِ فارسی

(۱) ایک برہمن زادہ (یعنی علامہ اقبال خود) روم (مراد ہیں مولانا رومی) اور تبریز (مراد ہیں شمس تبریزی) کے علوم کا حامل اور ان کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔

(۲) و (۳) مثنویٔ مولویِ معنوی یعنی مثنوی مولانا رومؒ دراصل فارسی زبان میں قرآن ہی کی ترجمانی ہے اور میں ان (مولانا رومؒ) کی صفات اس کے علاوہ اور کیا بیان کروں کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن انہیں کتاب بہرحال عطا ہوئی ہے۔

(۴) تا (۶) اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو، اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور کی ترجمانی ہے، تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے فخر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرمادیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کردیں (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کردیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرمادیں!

(۷) تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہوجاتا ہے۔ (کاش کہ تو جان لے کہ) ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل سلگتے رہنا! (نہ کہ ایک بار بھڑک کر ختم ہوجانا!)

(۸) ہماری بقا سلگتے رہنے ہی میں ہے۔ اور ہم پر مچھلی کی طرح تڑپتے رہنے کے سوا ہر شے حرام ہے۔

(۹) جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا کُل خشک و تر اس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔

(۱۰) خود کو درِ مصطفےٰ تک پہنچا کر دم لو۔ اس لیے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آسکے گا!

(۱۱) اے مرے جذبۂ عشق، اے میری عزیز متاع اور اے میرے جملہ امراض کے معالج، تو سدا شاد و آباد رہے!

(۱۲) و (۱۳) اس کے (یعنی بندۂ مومن) کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ "تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"! اسی طرح جذبۂ صریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے، وہ (نسلی، لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے!

(۱۴) یہ (میرا جملہ مال واسبابِ دنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے، ورنہ ہر شے کا مالکِ حقیقی تو خدا ہی ہے!

(۱۵) شریعتِ حقّہ اور نظامِ اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

(۱۶) (جانتے ہو؟) قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سرو سامان لوگوں کا سہارا و آسرا!

(۱۷) دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقّع نہ کرو۔ (اس لیے کہ قرآن نے صاف فرمادیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کرسکتے جب تک (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو!

(۱۸) سُود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سُود قرض دینے کی لذّت کسی کو معلوم نہیں!

(۱۹) سُود سے رُوح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔

(۲۰) زمین سے اپنے لیے رزق کا حصول جائز ہے۔ (لیکن) یہ انسان کے لیے صرف استعمال کی چیز ہے، ملکیت صرف خدا کی ہے۔

(۲۱) بندۂ مومن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے، مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہوجانے والا ہے!

(۲۲) حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہوجاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیاں کی بستیاں خوار و بدحال ہوجاتی ہیں۔

(۲۳) ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے۔ اس لیے کہ آدم کا پُورا خاندان ایک

جان کے مانند ہے۔

(۲۴) جب اس دنیا میں قرآنی تعلیمات کا سکہ چلا تو کہانت اور پاپائیت ایسے تمام گمراہ کن سلسلوں کا زور ٹوٹ گیا۔

(۲۵) مسلمانوں سے کہو کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!

(۲۶) (لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ) ہماری محفل ساقی اور شراب سے تہی دست رہ گئی ہے یعنی قرآن کے ساز کی صرف آواز ہی آواز باقی رہ گئی ہے!

(۲۷) وہ زندہ کتاب، قرآن حکیم، جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

(۲۸) زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ۔ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲۹) اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(۳۰) نوعِ انسانی کے لیے (خدا کا) آخری پیغام۔ جس کے لانے والے تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار پائے (صلی اللہ علیہ وسلم!)

(۳۱) اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آکر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس ایک کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنّف بن گئے!

(۳۲) وہ (کتاب) کہ جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی نہ اُٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا!

(۳۳) (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؛ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

(۳۴) یہ ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(۳۵) اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار

زمانے موجود ہیں!

(۳۶) (لیکن افسوس کہ اے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!

(۳۷) ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے!

(۳۸) اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(۳۹) (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے!

(۴۰) اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادیؒ سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمیؒ سے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مُرسَل حدیثوں سے رہ گیا ہے!

(۴۱) کوئی صاحبِ قرآن ہو اور پھر بھی اس میں نہ جذبہ ہو نہ حوصلہ و امنگ، یہ کتنی تعجّب خیز اور حیرت آمیز بات ہے!!

(۴۲) ہمارے سامنے ایک پُرانا اور گھسا پٹا عالَم ہے اور ملّتِ اسلامی اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔

(۴۳) (مسلمان اقوام مثلاً) مغلوں اور کُردوں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہو گئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہو گئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہو گئے ہیں!

(۴۴) (اے مسلمان!) تیری ذلّت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!

(۴۵) اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے!) اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتاب زندہ موجود ہے! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)

(۴۶) اے مسلمان! تیرا ایمان رسومات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر و مقید ہے!

(۴۷) تو نے اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے!

(۴۸) (اب) اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے!

(۴۹) اس کتاب کا حقِ تلاوت تم ادا کر دو۔ پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کر لو۔

(۵۰) (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے!

(۵۱) بندۂ مومن آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور اِس عالم کی حیثیت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا۔

(۵۲) جب اس کے لباس کی کوئی قبا یعنی کوئی عالم پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہانِ نو عطا فرما دیتا ہے۔

(۵۳) عصرِ حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہانِ نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو!)۔ اے مسلمان اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کر لے!

(۵۴) اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآنِ عظیم ہونے پر فخر ہے، آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے؟

(۵۵) (اُٹھو اور) دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعتِ اسلامی کے رموز و حِکَم کی تشہیر و اشاعت کے لیے سرگرم ہو جاؤ۔

(۵۶) شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے، اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے!

(۵۷) بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت و ہدایت) کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے!

(۵۸) قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔

(۵۹) جانتے ہو یہ قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہو سکتا۔

(۶۰) (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق و شوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا نام ہے۔ یہ محض زبان اور ہونٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور پوری ہستی کے ساتھ کرنے کا کام ہے۔

(۶۱) (اے مسلمان) اگر دوام و ثبات اور قوت و استحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دستِ سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا سراغ ملا ہے!

(۶۲) یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا، بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں خوف باقی رہتا ہے (نہ حزن!)

(۶۳) میں نے قرآن کے بحرِ بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور "صِبغَۃَ اللّٰہ" کے اسرار و رموز کی شرح بیان کر دی ہے۔

(۶۴) میرے فکر کی یہ بلندی اور گردوں نوردی سراسر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے طفیل میرے خیالات میں بحرِ بیکراں کی سی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

(۶۵) پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا لینے میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادۂ عمل ہو جا تاکہ تو شمشیر برہنہ کے مانند چمکنے لگے!

(۶۶) وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملّتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

(۶۷) ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں، ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے

(۶۸) (اے ملّتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو) اپنے آپ کو موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ اور پرو لے۔ ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور منتشر (اور ذلیل و خوار) رہ!

مدیر "ندائے خلافت" اقتدار احمد مرحوم کی پہلی باقاعدہ تصنیف

جو ان کی زندگی میں شائع ہونے والی آخری کتاب بھی ثابت ہوئی !

ترکی کے ایک سفر کی تاثراتی روداد

جس میں وہ امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ہمرکاب تھے

زبانِ یارِ من ترکی ...

اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے ایک منفرد سفرنامہ

جو قاری کو جابجا دعوتِ فکر بھی دیتا ہے اور اسلام کی عظمتِ پارینہ کے حوالے سے خون کے آنسو بھی رلاتا ہے۔

جس میں دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات کی صحیح صحیح منظر نگاری بھی ہے' اور زبان و ادب کی چاشنی بھی!

جس میں حقائق کی نہایت عمدہ لفظی تصویر کشی ہی پر اکتفا نہیں کی گئی' ترکی کے قابل دید مقامات کی دیدہ زیب رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں

جسے بجا طور پر حسنِ معنوی اور حسنِ ظاہری کا دلآویز مرقع قرار دیا جا سکتا ہے

عمدہ کمپیوٹر کتابت' نفیس طباعت' دبیز سفید کاغذ' خوشنما سرورق' مضبوط دیدہ زیب جلد

صفحات ۲۰۰ ' قیمت -/۱۲۰ روپے

شائع کردہ : مکتبہ وحدتِ ملی' ۴۰-بی' اردو بازار' فون ۷۲۲۸۸۷۲

نوٹ : رفقاء و احباب کی سہولت کے لئے یہ کتاب پاکستان کے مختلف شہروں میں قائم تقریباً تمام تنظیمی مراکز میں مہیا کر دی گئی ہے۔

متنِ قرآن مجید کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کی کاوشیں

ڈاکٹر حافظ محمود اختر

(آخری قسط)

عربی زبان کی محفوظیت

قرآن مجید کی صحت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی زبان بغیر کسی زمانی انقطاع کے ایک زندہ و جاودان زبان ہے۔ الہامی مذاہب اور الہامی کتب میں قرآن مجید واحد ایسی کتاب ہے جس کی زبان آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ چودہ سو سال کے طویل عرصے کے دوران بہت سے حادثات اور تہذیبی اختلاط ہوئے لیکن قرآن کی عربی میں کوئی سرِمُو تبدیلی نہیں آنے پائی۔ اس کے مقابلے میں سابقہ کتب سماوی مختلف سماجی حالات و حادثات کے نتیجے میں تبدیلیوں کا شکار ہو گئیں' یہاں تک کہ کتب سابقہ کی ابتدائی زبان ختم ہی ہو گئی۔ قومی اختلاط' تہذیبی تصادم' سیاسی انقلاب اور زمانی تبدیلی کے دوران زبان بدل کر کچھ کا کچھ ہو گئی۔ گو اسی طرح کے واقعات عربی کے ساتھ بھی ہوئے لیکن اس سب کچھ کے باوجود کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ عربی زبان میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب کی جانب آئے۔ یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے۔ عمالقہ سے ملنے کے بعد یہودیوں کی زبان عربی ہو گئی' لیکن یہ عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانے پر ہوا جب وہ ان علاقوں سے نکلے جو ایشیا اور افریقہ کے ممالک تھے اور ان کی زبانیں غیر عربی تھیں۔ اس اختلاط کے باوجود عربی زبان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عرب کے اندر مختلف لہجے تھے۔ بنو تمیم "جیم" کا تلفظ "یاء" سے کرتے تھے' مسجد کو مسید اور شجرات کو سیرات کہتے تھے۔ وہ "قاف" کو "جیم" بولتے تھے۔ مختلف قبائل کے

ملنے سے لسانی تاریخ کے عام اصول کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہو جانا چاہئے تھا جو بالآخر ایک نئی زبان کی صورت میں ظاہر ہوتا' مگر قرآن کے بر تر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضے میں لے رکھا تھا کہ اس کے اندر ایسا عمل نہ ہو سکا۔[۳۷] ڈاکٹر احمد حسن زیات لکھتے ہیں :

ما کانت لغة مضر بعد الاسلام لغة امةٍ واحدةٍ وانما کانت لغة لجمیع الشعوب التی دخلت فی دین اللہ[۳۸]

"اسلام کے بعد عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں رہی بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو اللہ کے دین میں داخل ہو گئے تھے"۔

مسلمانوں نے عراق' ایران اور مصر کو فتح کیا جہاں متمدن سلطنتیں اور ترقی یافتہ زبانیں موجود تھیں۔ ان کے ساتھ ملنے کے نتیجے میں نئی زبان پیدا ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کی عربی میں سرِ مو تبدیلی نہیں آئی۔ عباسی دور میں ایرانی عناصر کو غلبہ حاصل ہوا۔ ۹۲۳ھ میں مصر و شام سے فاطمین کا خاتمہ اور پھر ۸۹۸ھ میں ہسپانیہ کا زوال ہوا۔ اس سے عربی تمدن کو دھچکا لگا۔ ترکی رسم الخط جاری ہو گیا۔ عالم عرب پر ساڑھے پانچ سو سال ایسے گزرے ہیں جب ان پر عجمی حکمران تھے ----- ترک اور ایرانی لوگ عربی اثرات ختم کرنے کے لئے سرگرم تھے' لیکن عربی زبان کو ان کی کوششوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔[۳۹]

زبان کی تبدیلی کا دوسرا سبب ادبی ارتقاء ہوتا ہے لیکن قرآن مجید نے ادب کا ایسا معیار پیش کر دیا تھا کہ کسی ارتقاء کی گنجائش ہی باقی نہ رہی' بلکہ اس کے معیار کو حاصل کرنے کی کوششیں ہی جاری رہیں۔ پروفیسر نکلسن اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"عربی زبان ساری دنیائے اسلام کی زبان بن گئی اور یہ یقینی طور پر قرآن کا اعجاز ہے کہ قرآن نے عربی زبان و ادب پر حیران کن اثرات مرتب کئے۔ متن قرآن کو تحریف سے بچانے اور اس کی مشکل آیات کی تشریح و توضیح کے لئے مسلمانوں نے نحو اور لغت نویسی ایجاد کی۔[۴۰]

دنیا کی عام زبانیں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ایک صدی گزرنے

کے بعد اس کی ہیئت و بناوٹ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ محاورات، تلفظ، ضرب الامثال وغیرہ بدل جاتی ہیں، لیکن قرآن مجید کی زبان قدیم ترین زبان ہونے کے باوجود اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اگرچہ محاورات اور روزمرہ کی زبان میں کچھ تبدیلی آئی لیکن اصل زبان ختم نہیں ہوئی۔ عربی کا معاملہ محض ایسا ہی نہیں کہ وہ ایک قوم یا علاقے کی زبان ہے بلکہ اس کا تعلق ایک ایسی کتاب اور دین کے حوالے سے ہے جس نے قیامت تک موجود رہنا ہے۔ اگر اس کا معاملہ محض ایک قوم اور علاقے کی زبان کا ہوتا تو اس کی اصل بھی آج معلوم نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس زبان کو قائم و دائم رکھنے کا اہتمام فرمایا اور علمائے اسلام نے اس کا اہتمام بھی کیا کہ یہ زبان سلامت رہے اور اس کے قائم و سلامت رکھنے کو ایک دینی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ علامہ سیوطی نے مزہر میں لکھا ہے کہ :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ لغتِ عربی کا سیکھنا اور معلوم کرنا دین کی ضروریات میں داخل ہے اور یہ ایک فرض کفایہ ہے"۔[۴۱]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درسِ قرآن دینے والوں پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ عربی زبان سے پورے طور پر واقف ہوں۔ بعض اہل لغت نے عربی زبان کی ضرورت کو اس طرح بیان کیا ہے :

حفظ اللغات علینا فرضٌ کفرض الصلٰوۃ

فلیس یضبط دین الا تحفظ اللغات[۴۲]

یعنی لغات عربی نماز کی طرح ہم پر فرض ہے کیونکہ دین کو لغات کی حفاظت کے بغیر محفوظ نہیں کیا جاسکتا۔ (دین کی توجیہات و توضیحات محفوظ نہ رہ سکیں گی) اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جس عربی زبان کو محفوظ کرنا مطلوب ہے وہ قرآن مجید کی عربی ہے نہ کہ عام محاوراتی زبان۔ ماہرین عربی لغت نے اس بات کا اہتمام کیا کہ قرآنی عربی دیگر زبانوں کے اختلاط سے بچی رہے۔ لغت عربی کی تصنیف و تدوین کرنے والوں نے اس کا اہتمام کیا کہ عرب کے صرف ان قبائل کی لغت کو بنیاد بنایا جن کا اختلاط دیگر قوموں کے ساتھ نہ تھا۔ کوفہ، بصرہ وغیرہ کی عربی کو بنیاد نہیں بنایا جہاں دیگر زبانوں کے ساتھ اس کا اختلاط ہو گیا تھا۔ پھر جن قبائل کی لغت کو کتابوں میں مدون کیا گیا وہ بھی ویسے ہی سنی سنائی باتوں کی طرح جمع

نہیں کر دیا بلکہ علمائے اسلام نے جو اصول روایت حدیث کو غیر معتبر اور ضعیف روایات سے پاک رکھنے کے لئے حدیث رسول ؐ میں استعمال فرمائے اسی طرح کے اصولوں سے لغت عرب کو محفوظ و مدون کیا ہے۔ مثلاً ابن الانباری نے اپنی کتاب لمع الادلہ میں لکھا ہے :

"جو الفاظ قرآن مجید میں یا حدیث کی روایات متواترہ میں آئے ہیں وہ متواتر اور قطعی ہیں۔ یعنی جن معانی کے لئے قرآن و حدیث میں مستعمل ہوئے ہیں ان کے وہی معانی یقینی ہیں۔ زبان یا زمان کے بدلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا"۔ ۴۳

امام رازی فرماتے ہیں :

"لغت اور قواعد صرف و نحو کا وہ حصہ جو نزول قرآن اور عہد رسالت کے زمانہ سے معروف ہے اور تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا ہے وہ قطعی ہے۔" ۴۴

اسی طرح منقطع اور اخبار احاد' موضوع اور مؤلّد کی طرح کی اصطلاحات احادیث کی طرح لغت میں بھی مستعمل ہیں۔ معتبر حدیث سے ثابت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

احبوا العرب لثلاث فانی عربی والقرآن عربی ولسان اھل الجنۃ عربی ۴۵

"عربی زبان سے تین وجوہ کی بنا پر محبت کرو۔ ایک یہ کہ میں عربی ہوں' (دوسرے) قرآن مجید عربی میں ہے اور (تیسرے) اہل جنت کی زبان عربی ہے"۔

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ باقی الہامی کتب کے برعکس قرآن مجید واحد کتاب ہے جو نہ صرف خود محفوظ ہے بلکہ اس کی زبان بھی محفوظ ہے اور اس کی زبان کی حفاظت کا اہتمام بھی پوری احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عربی زبان کی حفاظت بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

تلاوتِ قرآن پر مداومت

مرورِ زمانہ کے ہاتھوں زبان کے مٹ جانے یا دوسری زبانوں سے متاثر ہو کر اپنی اصلیت کھو جانا تو دور کی بات ہے' قرآن مجید کا تسلسل تو ہر دور میں جاری رہا ہے۔ مسلمان دن میں پانچ مرتبہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ روزانہ تلاوت قرآن مجید مسلمانوں کی روز مرہ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اس کے حفظ کی مثال دنیا کا کوئی اور مذہب پیش نہیں کر

سکتا۔ اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حفظ قرآن کی جو ترغیبات دیں اور اس کا اجر و ثواب بیان فرمایا اس کی وجہ سے مسلمانوں نے ہر دور میں حفظ قرآن کا اہتمام کیا۔ چند ایک احادیث ملاحظہ ہوں :

۱) عن ابی سعید یقول الرب تبارک وتعالیٰ من شغله القرآن عن ذکری و مسئلتی اعطیته افضل ما اعطی السائلین وفضل کلام الله علی سائر الکلام کفضل الله علی خلقه[۴۶]

ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے : "جو شخص قرآن میں اس طرح مشغول ہو کہ مجھ سے دعا کر سکے اور نہ میری یاد' تو میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ عطا کروں گا۔ اللہ کے کلام کو باقی دوسرے کلاموں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر"۔

۲) یقال لصاحب القران اقراء وارتق ورتل کما کنت ترتل فی الدنیا فان منزلک عند اخر آیة تقرء ها[۴۷]

"(قیامت کے دن) قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا (اور جنت کی منازل) چڑھتا جا۔ اور جس طرح ٹھہر ٹھہر کر تو دنیا میں قرآن پڑھتا تھا اسی طرح پڑھتا جا۔ جہاں تیری آخری آیت ہو گی وہیں تیرا مقام ہو گا"۔

۳) ان افضلکم من تعلم القرآن وعلمه[۴۸]

"بیشک تم میں سب سے زیادہ فضیلت والا وہ ہے جو قرآن مجید پڑھتا اور پڑھاتا ہے"۔

قرآن مجید کی تلاوت پر مداومت اختیار کرنے کے حوالے سے حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے :

عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم "تعاهدوا القران فو الذی نفسی بیده هو اشد تفضیا من الابل فی عقلها[۴۹]

"حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : قرآن مجید میں مزاولت کرو کیونکہ قرآن سینوں سے جانے میں اس اونٹ سے تیز ہے جو اپنی بندش سے چھوٹ جائے"۔

ترمذی شریف میں روایت ہے :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : يجيء صاحب القران يوم القيامه فيقول يارب حله' فيلبس تاج الكرامة' ثم يقول : يارب زده' فيلبس حلة الكرامه' ثم يقول : يارب ارض عنه' فيرضى عنه' فيقال : اقرأ وارقأ يزداد بكل اية حسنة ۵۰

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا : قیامت کے دن جب قرآن کے عالم باعمل کو لایا جائے گا تو قرآن (اس کی سفارش کرے گا اور) کہے گا کہ اے اللہ اسے خلعت عطا فرما۔ اس پر بزرگی کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے گا۔ پھر قرآن سفارش کرے گا کہ اے رب اسے مزید عطا فرما! چنانچہ اسے عظمت و فضیلت کا لباس پہنایا جائے گا۔ قرآن پھر کہے گا کہ اے رب اس سے راضی ہو جا! تو اللہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا : پڑھتا جا اور (جنت کے درجات) چڑھتا جا۔ اور ہر آیت کے بدلے ایک نیکی کا اضافہ کیا جائے گا"۔

قرآن مجید کے متن کی حفاظت کے ظاہری اہتمام میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے تاکہ اس کے متن سے بے نیازی اور لاپرواہی کا رجحان پیدا نہ ہو۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ مصحف کو دیکھ کر قراءت کرنا حافظہ کے اعتماد پر قراءت کر کے پڑھنے سے افضل ہے کیونکہ مصحف کا دیکھنا بھی ایک مطلوبہ عبادت ہے۔ ۵۱

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں کہ "ہمارے اصحاب کا یہی قول ہے اور سلف بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیوطیؒ لکھتے ہیں : "جس شخص کا خشوع اور تدبر حافظہ سے زبانی پڑھنے اور ناظرہ پڑھنے دونوں حالتوں میں یکساں رہتا ہے اس کے لئے مصحف دیکھ کر پڑھنا بہتر ہے"۔ وہ لکھتے ہیں :

"میں کہتا ہوں مصحف کو دیکھ کر پڑھنے کا زائد ثواب ہونے کی دلیل وہ قول ہے کہ بغیر مصحف دیکھے قراءت کرنے کے ہزار درجے ہیں اور دیکھ کر پڑھنے کے دو ہزار درجے ہیں"۔ ۵۲

قرآن مجید آنکھوں سے دیکھ کر پڑھنے کے روحانی اور مادی' دونوں طرح سے فوائد ہیں لیکن اس سے متن کی طرف توجہ بھی مبذول رہتی ہے۔ اس سلسلے میں چند احادیث نبویہ ملاحظہ ہوں :

i) عن عمرو بن اوس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : قراء تک نظرًا تضاعف علی قراء تک ظاھرًا کفضل المکتوبۃ علی النافلہ ۵۴

"عمرو بن اوسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرنا اس کی زبانی تلاوت پر وہی فضیلت رکھتا ہے جو فرض نمازوں کو نفل نمازوں پر ہے"۔

ii) عن عبادہ بن الصامت قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: افضل عبادۃ امتی قراء ۃ القرآن نظرًا ۵۵

"عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : میری امت کی افضل ترین عبادت قرآن مجید کو ناظرہ پڑھنا ہے"۔

iii) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من قرءَ القرآن فی المصحف کتب لہ الفا حَسنۃ ومن قرء فی غیر المصحف فالف حسنۃ ۵۶

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو قرآن کو مصحف سے (دیکھ کر) پڑھے اس کے لئے دو ہزار اور زبانی تلاوت کرنے والے کے لئے ایک ہزار نیکیاں ہیں"۔

iv) اسی طرح ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا : "جو شخص قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ جنت میں ایک درخت لگا دیتے ہیں"۔ ۵۷

v) بیہقی میں ابن مسعودؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :
"جس شخص کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت رکھنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے اسے چاہئے کہ وہ مصحف کو دیکھ کر پڑھے"۔ ۵۸

vi) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

من ادام النظر فی المصحف متع ببصرہ مادام فی الدنیا[۵۹]

"جو شخص قرآن مجید کو ہمیشہ دیکھ کر پڑھتا ہے اس سے اس کی آنکھوں (بصارت) کو زندگی بھر فائدہ پہنچتا ہے"۔

vii) بیہقی میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے :

ادیموا النظر فی المصاحف[۶۰]

"مصحف میں ہمیشہ نظر کرتے رہو"۔

"رسم عثمانی" کا التزام

قرآن مجید کی حفاظت کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو خصوصی اہتمام کیا' اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس کی کتابت کے لئے "عثمانی رسم الخط" کا التزام کیا اور کسی کو اس کے علاوہ کسی اور طریق سے قرآن مجید لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس لکھنے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں :

تحرم مخالفة خط مصحف عثمان فی واو اویاء اوالف اوغیر ذلک[۶۱]

"واؤ ہو یا الف ہو یا یاء کسی حرف کے لکھنے میں بھی عثمانی رسم الخط کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے"۔

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ یہ فرمایئے کہ آج کل اگر کوئی شخص قرآن لکھنا چاہے تو آیا لوگوں کے ایجاد کردہ جدید حروف ہجا کے مطابق لکھ سکتا ہے؟ آپؒ نے فرمایا :

لا' الاعلی الکتبة الاولی[۶۲]

"نہیں' اسے اسی طرح لکھنا چاہئے جیسے پہلے کاتبوں نے لکھا تھا"۔

علامہ الدانی نے المقنع میں یہ قول نقل کیا ہے کہ

"اس نقطہ نگاہ کے مخالف کسی کا بھی نقطہ نگاہ نہیں ہے"۔[۶۳]

بیہقیؒ نے "شعب الایمان" میں بیان کیا ہے کہ

"جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی رسم الخط

میں لکھے جس میں صحابہ کرامؓ نے ان مصاحف کو لکھا تھا اور اس میں ان سے اختلاف نہ کرے۔ان کی لکھی ہوئی کسی چیز میں تبدیلی نہ کرے"۔[۶۴]

زرقانی لکھتے ہیں :

وقال العلامة نظام الدين نيسا بورى ما نصه : وقال جماعة من الائمه ان الواجب على القراء والعلماء واهل الكتابة ان يبتغوا هذا الرسم فى خط المصحف' قاله رسم زيد بن ثابت' وكان امين رسول الله ﷺ وكاتب وحيه[۶۵]

"علامہ نظام الدین نیساپوری کہتے ہیں: ائمہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ قراء' علماء اور اہل کتاب پر واجب ہے کہ وہ مصحف کی کتابت میں اس رسم الخط کا التزام کریں۔اسے انہوں نے زیدؓ بن ثابت کا رسم الخط قرار دیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد اور آپؐ کے کاتب وحی تھے"۔

مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد نے اپنے رسالہ خلاصة النصوص الحلبية میں رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ثابت ہونا بیان کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں :

اجمع المسلمون قاطبة علىٰ وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته....قال العلامه ابن عاشر وجه وجوبه ما تقدم من اجماع الصحابة عليه وهم زهاء اثنى عشر الفا والاجماع حجة حسبما تقرر فى اصول الفقه[۶۶]

"مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع کے واجب ہونے اور اس کے خلاف ممنوع ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے....علامہ ابن عاشر کا بیان ہے کہ اس کے واجب ہونے کی وجہ وہی ہے جو گزر چکی یعنی صحابہ کرامؓ کا اجماع اور یہ تقریباً بارہ ہزار اصحاب تھے اور جیسا کہ اصول فقہ میں ثابت شدہ ہے کہ اجماع صحابہ حجت قطعیہ ہے"۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے علامہ زرکشی کا یہ قول نقل کیا ہے :

والاقرب المنع کما تحرم قرآنہ بغیر لسان العرب [۱۷]

"اقرب الی الحق یہی بات ہے کہ غیر عربی رسم الخط ممنوع ہے"۔

علامہ شرنبلالی نے "النفحۃ القدسیۃ فی احکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیہ" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ہمارے مسئلہ زیر بحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے حافظ ابن حجر عسقلانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ "قرآن مجید غیر عربی رسم الخط میں لکھنا حرام ہے"۔ جب کہ ان سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا قرآن کریم کی کتابت بھی عجمی رسم الخط میں حرام ہے جس طرح کہ اس کی قراءت عجمی زبان میں حرام ہے؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ غیر عربی رسم الخط میں کتابت قرآن کی حرمت پر اجماع ہے"۔ [۱۸]

ابن قدامہؒ نے اپنی کتاب "المغنی" کے حواشی میں اس مسئلے کی وضاحت کی ہے کہ قرآن مجید جب سے نازل ہوا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت عرب و عجم اور تمام اقوام عالم کو پیش کی تو کہیں بھی ایسا واقعہ ثابت نہیں کہ آپؐ نے عجمیوں کی رعایت سے اس کا ترجمہ کر کے بھیجا ہو یا عجمی رسم الخط میں اس کے لکھنے کی اجازت دی ہو"۔ [۱۹]

ہدایہ کے مصنف شیخ برہان الدین مرغینانیؒ اپنی ایک اور تصنیف "التجنیس والمزید" میں لکھتے ہیں :

یمنع من کتابہ القرآن بالفارسیہ بالاجماع [۲۰]

"قرآن مجید کی کتابت فارسی زبان میں بالاجماع ممنوع ہے"۔

اسی طرح طرح "معراج الدرایہ" میں ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنا سخت ترین ممنوع اور ایسا قصداً کرنے والا زندیق ہے۔ [۲۱] کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو اسے روک دیا جائے۔ [۲۲] ہدایہ کی شرح کمال بن ہمام کی تصنیف فتح القدیر اور کافی میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص فارسی میں قرآن پڑھنے یا لکھنے کا قصد کرے تو اسے روک دیا جائے۔ [۲۳] علامہ شرنبلالی ان روایات کو ذکر کرنے کے بعد

لکھتے ہیں کہ فارسی کا بطور خاص ذکر کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ باقی زبانوں میں ایسا کرنا جائز ہے۔ فارسی کا تذکرہ اس لئے ہے کہ (عربی کے بعد) فارسی سے فصیح کوئی اور زبان نہیں ہے۔ در مختار میں بھی یہی لکھا ہے کہ یہ بات فارسی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر زبان مراد ہے۔[۴۴]

۱۳۵۹ھ میں جمعیت الاسلام صوبہ متحدہ ناظرباغ کانپور کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ دیوبند کی مجلس علمی میں پیش کیا گیا۔ اس مجلس نے یہ فیصلہ دیا کہ

> قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں لکھنا قرآن میں تحریف ہوگی جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے۔[۴۵]

اس مجلس کے صدر مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، قاری محمد طیبؒ، مولانا اعزاز علیؒ اور مولانا سید اصغر حسینؒ شامل تھے۔ ان حضرات کے علاوہ بھی کئی ایک اکابر علماء نے اس کی تصدیق کی۔ قاضی محمد حبیب اللہؒ نے لکھا:

> "قرآن مجید میں مصحف عثمانیہ کے موافق جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے سیدھی جانب سے لکھنا چاہئے۔ اس پر آج تک تعامل اور اجماع امت ہے۔ اس کے برعکس بائیں جانب سے لکھنا جائز نہیں۔ قرآن مجید لکھتے وقت رسم الخط عثمانی کی مخالفت جائز نہیں"۔[۴۶]

ان حضرات میں سے ایک مولانا عبد الغنی تھے۔ آپ نے اس سلسلے میں لکھا:

> فان الکتابة بخلاف المصاحف العثمانية بدعة مذموعة وفعل شنیعة باتفاق الامة۔[۴۷]

> "بے شک مصحف عثمانی کے رسم الخط کے برخلاف قرآن لکھنا ایک ایسی بدعت ہے جس کی مذمت کی گئی ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ناپسندیدہ فعل ہے۔"

حواشی

۳۷۔ زیات، احمد حسن، تاریخ ادب عربی، صفحہ ۳
۳۸۔ زیات، احمد حسن، تاریخ ادب العربی، صفحہ ۱ (مقدمہ) ۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ Nicholson, A Literary History of the Arabs, P.32
۴۱۔ محمد شفیع، مفتی، مقدمہ المنجد، صفحہ ۲۲
۴۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۲
۴۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۲
۴۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۔۲۴
۴۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۱
۴۶۔ خطیب تبریزی، ولی الدین، مشکوۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن
۴۷۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، باب فضائل القرآن
۴۸۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب خیرکم من تعلم القران وعلمه
۴۹۔ ایضاً، باب استذکار القرآن وتعاهده
۵۰۔ ترمذی، جامع ترمذی، باب فضل القرآن وقارئه
۵۱۔ سیوطی، الاتقان، جلد اول، صفحہ ۱۱۰
۵۲۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۱۱۰
۵۳۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۱۱۰
۵۴۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد چہارم، صفحہ ۶۱۷ (فضائل القرآن)
۵۵۔ علی المتقی، کنز العمال، جلد اول، صفحہ ۵۲۶ روایت نمبر ۲۳۵۸
۵۶۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۵۳۶ حدیث نمبر ۲۵۰۵
۵۷۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۵۴۹۔ حدیث نمبر ۲۴۵۸
۵۸۔ سیوطی، الاتقان، جلد اول
۵۹۔ کنز العمال، جلد اول، صفحہ ۵۳۵، حدیث نمبر ۲۵۰۶
۶۰۔ سیوطی، الاتقان، جلد اول، صفحہ ۱۱۰
۶۱۔ زرقانی، جلد اول، صفحہ ۲۷۲
۶۲۔ زرقانی، عبدالعظیم، جلد اول، صفحہ ۲۷۲
۶۳۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۲۷۲
۶۴۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۲۷۳
۶۵۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۲۷۳
۶۶۔ بحوالہ تحذیر الانام، صفحہ ۱۱
۶۷۔ سیوطی، جلال الدین، الاتقان، جلد اول، صفحہ ۶۳
۶۸۔ بحوالہ تحذیر الانام، صفحہ ۹
۶۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۰
۷۰۔ ایضاً، ۱۰
۷۱۔ بحوالہ محمد شفیع، مفتی، جواہر الفقہ، صفحہ ۹۸
۷۲۔ بحوالہ ایضاً، صفحہ ۹۸
۷۳۔ ایضاً، صفحہ ۹۹
۷۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۰
۷۵۔ تحذیر الانام، صفحہ ۱۳
۷۶۔ ایضاً
۷۷۔ ایضاً

سورۃ البقرۃ

آیات ۶۹ ــ ۷۱

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ' الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱' الاعراب کے لیے ۲' الرسم کے لیے ۳' اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۴۴:۲ الإعراب

زیر مطالعہ قطعۂ آیات (۶۹-۷۱) نحوی اعتبار سے آٹھ مستقل جملوں پر مشتمل ہے جس میں سے بعض بلحاظِ مضمون مربوط ہیں۔ اس طرح ان آیات کو ترکیب نحوی اور جملہ وار تجزیہ کے لیے کل چھ جملوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ تفصیل یوں ہے۔

(۱) قالوا ادع لنا ربك يبيّن لنا ما لونُها ۚ

اس کا ابتدائی حصہ (قالوا ۔ ۔ ۔ ۔ یبین لنا) اس سے پہلے البقرہ: ۶۸ میں مع بیان اعراب گزر چکا ہے [۲:۴۳:۲] میں ۔ اس عبارت کے بعد وہاں تھا "ماھِیَ" اور یہاں ہے [مالونُھا] جو اعرابی صورت وہاں "ماھِیَ" کی تھی وہی یہاں "مالونھا" کی ہے یعنی "ما" استفہامیہ بطور خبر مقدم

ہے لہٰذا محلاً مرفوع ہے۔ اور "لونھا" مضاف مضاف الیہ (لون + ھا) مل کر مبتدأ مؤخر (مرفوع) ہے۔ (اور بعض کے نزدیک "ما" مبتدأ مرفوع اور "لونھا" خبر مرفوع ہے) بہرصورت "لونھا" میں علامتِ رفع "ن" کا ضمہ (ـُ) ہے (اسماء استفہام کے فقرے میں مبتدأ یا خبر واقع ہونے کے فرق کی توجیہ بھی البقرہ: ۲۸ کے "الاعراب" میں [۲:۲۰:۲] میں بیان ہو چکی ہے)۔ یہ آخری جملہ اسمیہ (مالونھا) یہاں فعل "یبیّن" کا مفعول ہو کر محل نصب میں ہے۔ اس لیے کہ یہاں اگر "ما" نہ ہوتا تو "لونھا" منصوب ہو کر اس فعل "یبیّن" کا مفعول بن سکتا تھا یعنی بصورت "یُبیّن لنا لونھا" (کہ وہ واضح کرے ہمارے لیے اس کا رنگ)۔ زیر مطالعہ عبارت میں "ادع لنا" سے لے کر "لونھا" تک کی عبارت ابتدائی "قالوا" کا مقول ہو کر محلاً منصوب بنتی ہے یعنی "انھوں نے کہی (یہ بات...)"

(۴) قال انه یقول انها بقرة صفراء فاقعٌ لونُها تسر الناظرین

اس عبارت کا ابتدائی حصہ (قال انه یقول انها بقرة) بھی اس سے پہلے البقرہ: ۶۸ ہی میں بلحاظ اعراب زیر بحث آ چکا ہے دیکھئے [۲:۴۳:۲] میں ۵ وہاں بھی "بقرةٌ" کے بعد والی عبارت (لافارض ولا بکر عوان بین ذٰلك) اسی لفظ (بقرة) کی صفت کے طور پر آئے تھے۔ اور یہاں بھی اسی لفظ (بقرة) کے بعد کی عبارت (صفراءُ فاقع لونها تسر الناظرین) اسی (بقرة) کی صفت کے طور پر آئے ہیں۔ اور اس (صفت والی) عبارت کے اعراب یوں ہیں۔

[صفراءُ] بقرةٌ کی پہلی صفت ہے لہٰذا مرفوع ہے اس میں علامتِ رفع آخری ہمزہ کا ضمہ (ـُ) ہے کیونکہ یہ اسم غیر منصرف ہے۔ [فاقعٌ] اسم الفاعل بصورت صفت آیا ہے اور یہ بھی گائے کی دوسری صفت ہے مگر یہاں اس صفت نے (اسم الفاعل ہونے کے باعث) فعل کا سا عمل کیا ہے جس کی وجہ سے [لونُها] مضاف مضاف الیہ مل کر اس (صفت) کا فاعل ہو کر مرفوع ہو گیا ہے۔ گویا اصل (تقدیر) عبارت تھی "فقع لونُها" (اس فعل کے معنی دیکھئے اوپر [۲:۴۴:۱(۴)] میں یعنی لفظاً "شوخ زرد ہوا اس کا رنگ") اور "فاعل" (لون) کے مذکر ہونے کی وجہ سے اسم الفاعل (فاقع) مذکر آیا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "فاقِعٌ" کو خبر مقدم اور "لونھا" کو مبتدا مؤخر سمجھ لیں گویا دراصل عبارت بنتی ہے "لونُها فاقِعٌ" (اس کا رنگ شوخ زرد ہے) اور دراصل گائے کی صفت صرف "فاقع" نہیں بلکہ پورا جملہ "فاقع لونھا" ہے [تسر] فعل مضارع معروف واحد مؤنث غائب ہے جس میں ضمیر "ھی" برائے "فاعلہ" شامل ہے (یعنی وہ گائے خوش کرتی ہے) [الناظرین] اس فعل (تسر) کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے علامت نصب یائے ساکنہ ماقبل مکسور (ـِ ی)

ہے ۔("الناظرین" کے رسم قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی) ۔ اور یہ پورا جملہ فعلیہ (تسر الناظرین) "بقرۃ" کی تیسری صفت ہے (لہٰذا یہ بھی محلاً مرفوع ۔ جملہ ۔ ہے) ۔ یعنی وہ گائے) خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو۔

● بعض نحویوں نے "تسر" کی ضمیر فاعل "لونہا" کے "لون" کے لیے قرار دی ہے یعنی "لونہا تسر الناظرین" (اس کا رنگ خوش کرتا ہے دیکھنے والوں کو) ۔ اور "لون" کے لیے صیغہ تانیث (تسر) کی یہ توجیہ کی ہے کہ وہ (لون) مؤنث (ھا) کی طرف مضاف ہے ۔ لہٰذا اسے مؤنث کہا جاسکتا ہے ۔ یا یہ کہ یہاں "لون" سے مراد "صُفْرَۃٌ" (زردی) ہے اس لیے بلحاظ معنی صیغہ تانیث آیا ہے ۔ تاہم یہ دونوں توجیہات تکلف سے خالی نہیں ہیں اور محض "علم بگھارنے" والی بات ہیں ۔ مقدم الذکر توجیہ زیادہ معقول اور بآسانی قابلِ فہم ہے ۔

(۴) قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي ، ان البقر تشابه علينا ۔ وانا ان شاء الله لمهتدون

اس عبارت میں "قالوا" کے بعد (مقول) تین جملے ہیں جو مفعول (مقول) ہونے کے لحاظ سے سب محل نصب میں ہیں اور بلحاظ مضمون باہم مربوط ہیں (سب "قالوا" سے متعلق ہیں) ۔ ان میں سے پہلے جملہ (ادع لنا ربَّكَ يبين لنا ما هي ؟) کے اعراب بعینہٖ اسی قسم کے (اور اسی عبارت والے) سابقہ جملے میں (گزشتہ قطعہ میں) بیان ہو چکے ہیں دیکھئے [۲:۴۳:۲] میں ۱۲ ۔

● دوسرا جملہ "ان البقر تشابہ علینا" ہے (یعنی انہوں نے یہ بات بھی کہی کہ) [اِنّ] حرف مشبہ بالفعل اور [البقرَ] اس کا اسم منصوب ہے ۔ [تشابہ] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے جس کی ضمیر الفاعل (ھو) "البقرَ" کے لیے ہے اور یہ جملہ فعلیہ ہو کر "اِنّ" کی خبر ہے ۔ لفظ (البقر) اپنی ظاہر صورت کے لحاظ سے (بلحاظ لفظ) واحد ہے (اسی لیے فعل "تشابہ" اس کے مطابق واحد مذکر آیا ہے) ۔ اور بلحاظ معنی (پوری جنس ۔ گائے بیل کے لیے ہونے کی بنا پر) جمع بھی ہے [اس لیے اگر یہاں "تشابهت" یا "تشابَہُ" ۔ (صیغہ مضارع واحد مؤنث غائب (تَتَشَابَہُ) ایک "تا" کے حذف کے ساتھ) ہوتا تو عربی میں یہ جائز ہوتا مگر قرآن کریم میں قراءت روایتِ متواتر کے تحت ہوتی ہے اس میں صرفی یا نحوی قیاس نہیں چلتا ۔ البتہ یہ باتیں صرف عربی زبان سیکھنے میں مدد دے سکتی ہیں] ۔ [علینا] جار مجرور (علی + نا) مل کر فعل "تشابہَ" سے متعلق ہیں ۔ اس فقرے (ان البقر تشابہ علینا) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے: "بے شک سب گائے بیل باہم ملتے جلتے ہو گئے (ہیں) ہم پر" ۔ اس کو بامحاورہ بنانے کے لیے بعض مترجمین نے بہت سے

بیل (اور گائیں) ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں"۔ یا "ہم کو تو بہتیری گائیں (یا بیل) ایک طرح کی دکھائی دیتی ہیں"۔ سے ترجمہ کیا ہے اور چونکہ دو چیزوں کا باہم ملتا جلتا ہونا جو تشابہ کے بنیادی معنی ہیں)، اشتباہ (شبہ میں پڑنا) اور التباس (شک میں پڑنا) کا باعث ہو سکتا ہے اس لیے بعض مترجمین نے "تشابہٗ" (مصدر) کا ترجمہ "اشتباہ" (مصدر) سے کر لیا ہے یعنی "ہم کو قدرے اشتباہ ہو گیا ہے / ہم کو شبہ ہو گیا ہے / گایوں میں / بیلوں میں۔ اسے ہم توضیحی اور بامحاورہ ترجمہ تو کہہ سکتے ہیں مگر یہ اصل لفظ (تشابہَ) کے بنیادی معنی سے ذرا ہٹ کر ہی ہے۔ کیوں کہ ایک ہی مادہ (شبہ) سے مشتق ہونے کے باوجود "تشابہ" (باب تفاعل) اور "اشتباہ (باب افتعال) کے معنی اور استعمال جدا جدا ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بیشتر مترجمین نے یہاں (غالباً محاورہ کی خاطر) "اِنَّ" کا ترجمہ نظر انداز کر دیا ہے۔

● تیسرا جملہ "وانّا ان شاء اللہ لمھتدون" ہے یعنی پہلی دو باتوں کی طرح یہ بھی ان کے "قول" میں شامل ہے۔

[وَ] "اور" (ساتھ یہ بھی کہا کہ) [اِنّا] یہ "اِنَّ" اور اس کے اسم (ضمیر منصوب (نا) پر مشتمل ہے یعنی یہ "اِنَّنَا کی ہی دوسری شکل ہے۔ قرآنِ کریم میں دونوں صورتیں استعمال ہوئی ہیں [اِنْ] حرفِ شرط ہے اور [شاء] فعل ماضی معروف (واحد مذکر غائب) ہے جس کا فاعل [اللہ] (لہٰذا مرفوع) ہے [لمھتدون] یہ "اِنَّ" (اِنّا" والا) کی خبر ہے اس لیے مرفوع ہے اور اس پر لامِ مزحلقہ برائے تاکید آیا ہے۔ گویا اصل جملہ تو ہے "اِنّا لمھتدون"

● اب اس جملہ (انا لمھتدون) کے مبتدأ و خبر (اسم اِنَّ اور خبر اِنَّ) کے درمیان جو جملہ بطور (بیان) شرط (ان شاء اللہ) آیا ہے۔ اس کے جوابِ شرط کے بارے میں نحویوں کی مختلف آراء کی روشنی میں دو صورتیں ممکن ہیں۔

(الف) ایک تو یہ کہ خود جملہ "انا لمھتدون" میں "اِنَّ" کی خبر "لمھتدون" ہی (بمعنیٰ "اھتدَینا") اس کا جوابِ شرط موجود ہے۔ کیونکہ شرط کا "فعل" جوابِ شرط میں بھی ایک "فعل" چاہتا ہے۔ گویا بلحاظ معنی تقدیرِ عبارت یوں بنتی ہے "اِن شاء اللہُ (ھدایتَنا) اھتدَینا" (یعنی اگر اللہ تعالیٰ ہماری ہدایت چاہے گا تو ہم ہدایت پالیں گے)۔ اس صورت میں فعل "شاءَ" (چاہا) کا مفعول "ھدایتَنا" (ہماری ہدایت) بھی محذوف سمجھا گیا ہے۔ (خیال رہے کہ اوپر بصیغۂ ماضی آنے والے افعال (شاء اور اھتدینا) کا ترجمہ بصیغۂ مستقبل "اِنْ" شرطیہ کی وجہ سے مناسب ہے کیوں کہ شرط ماضی

پر نہیں ہوتی)۔

(ب) دوسری صورت (اِن شاء اللہ کے جواب کی) یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں جوابِ شرط محذوف ہے اور خود یہ جملہ (انا.... لمھتدون) اس پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ جوابِ شرط کے طور پر مقدم آیا ہے۔ اس لیے کہ جملہ شرطیہ کا پہلا حصہ (بیان شرط یعنی "ان شاء اللہ") یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر عبارت کے درمیان آیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے جیسے کہتے ہیں "اِنکَ ظالمٌ اِنْ فَعَلتَ کذا" (بے شک تو ظالم ہوگا اگر تو نے ایسا کیا (کرے گا) تو)۔ اس توجیہ کے مطابق تقدیر عبارت یوں بنتی ہے: "انا لمھتدون ان شاء اللہ (ھدایتنا)" (ہم ہدایت پانے والے ہوں گے اگر اللہ (ہماری ہدایت چاہے گا تو)۔

● دونوں (مندرجہ بالا ۱ و ۲) صورتوں میں فعل "شاء" کا مفعول (ھدایتنا) محذوف ہے۔ دوسری صورت (انا لمھتدون ان شاء اللہ ...) میں کلمۂ شرط (ان شاء اللہ) مؤخر ہے۔ مگر پہلی صورت (ان شاء اللہ انا لمھتدون) (ای اھتدینا) میں کلمۂ شرط مقدم مانا گیا ہے۔ اور غالباً یہی (پہلی صورت والی) وجہ ہے کہ اردو کے قریباً تمام مترجمین نے اس جملۂ (بیان) شرط (ان شاء اللہ) کا ترجمہ پہلے کیا ہے اور (جواب شرط کے طور پر) "انا لمھتدون" کا ترجمہ بعد میں کیا ہے۔

● اس عبارت (زیرِ مطالعہ) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے: "اور بے شک ہم اگر چاہا اللہ نے تو ضرور ہدایت پانے والے ہوں گے"۔ تاہم مندرجہ بالا پہلی صورت کو سامنے رکھتے ہوئے مترجمین نے ترجمہ کی ابتداً "خدا نے چاہا/ خدا چاہے/ خدا نے چاہا تو" سے کی ہے اور بعض نے "ان شاء اللہ" ہی رہنے دیا ہے کہ وہ اردو محاورہ میں مستعمل ہے۔ اور اس کے بعد "انا لمھتدون" کا ترجمہ غالباً محاورے کی مجبوری کی بنا پر جملہ اسمیہ کی بجائے جملہ فعلیہ سے کیا ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط یہاں فعل "شاء" کے مقابلے پر فعل (اھتدینا) ہی بنتا ہے جیسے اوپر بیان ہوا ہے۔ البتہ بصورت فعل ترجمہ بوجہ شرط مستقبل سے ہی کیا ہے یعنی: "ہم راہ پالیں گے، ضرور راہ پا جائیں گے، ٹھیک سمجھ جائیں گے، ٹھیک پتہ لگا لیں گے، ہمیں ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی"۔ کی صورت میں۔ بظاہر یہ سب "لمھتدون" کی بجائے "لنھتدِی" کا ترجمہ (یا مفہوم) معلوم ہوتے ہیں مگر شرط کے ساتھ مستقبل کا مفہوم اس کے سوا (شاید) پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

④ قال انه یقول انها بقرة لا ذلول تثیر الأرض ولا تسقی الحرث مسلمةٌ لا شیة فیها۔

یہ پوری عبارت اس گائے کی صفت بیان کرتی ہے۔ اس عبارت کا ابتدائی حصہ "قال انه

یقول انھا بقرۃ " اس سے پہلے آیت ۶۸ اور پھر ۶۹ میں گزر چکا ہے دیکھئے [۲:۴۳:۲] میں ۵ اور [۲:۴۴:۲] میں ۲۔ مذکورہ بالا دونوں مقامات کی طرح یہاں بھی "بقرۃ" کے بعد والی عبارت اس (بقرہ) کی تین ہی صفات بیان کرتی ہے [یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس سے پہلے آیت ۶۸ [۲:۴۳:۲ (۵)] میں بھی تین ہی صفات بیان ہوئی تھیں یعنی "لا فارض، ولا بکر، عوانٌ بین ذلك" پھر آیت: ۶۹ [۲:۴۴:۲ (۲)] میں بھی تین ہی صفات مذکور ہوئی تھیں، یعنی "صفراء فاقع لونھا اور تسر الناظرین" اور اب یہاں بھی تین ہی صفات بیان ہو رہی ہیں جن کی اعرابی تفصیل یوں ہے:

[لا ذلولٌ] آیت: ۶۸ والے "لا فارضٌ" کی طرح یہاں بھی "لا" تو برائے نفی (نہیں) ہے اور "ذلولٌ" "بقرۃٌ" کی صفت ہے۔ اسم صفت کے طور پر "فَعُولٌ" کا وزن مذکر مؤنث دونوں کے لیے یکساں ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں: رجل صبور وامرأۃ صبورٌ ۔ اس لیے یہاں ذلولٌ بلحاظ صفت "بیل" والے معنی کی تائید نہیں کرتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں "ذلولٌ" سے پہلے ایک مبتدأ (ہی) محذوف ہو اور یوں یہ جملہ "لا ھی ذلول" بھی "بقرۃ" کی صفت کا کام دے۔ [تُثیر الارضَ] میں "تثیر" فعل مضارع معروف (واحد مؤنث غائب) ہے جس میں ضمیر الفاعلہ (ھی) موجود ہے۔ اور "الارضَ" اس فعل (تثیر) کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے اور یہ فقرہ (تُثیر الارضَ) یا تو "ذلولٌ" کا حال لہٰذا محلاً منصوب ہے یعنی "وہ" ذلول "نہیں ہے کہ ایسی حالت میں ہو کہ ہل چلاتی ہو" یا پھر یہ جملہ (تثیر الارض) "ذلول" ہی کی (جو کہ نکرہ موصوفہ ہے) مزید صفت ہو کر محل رفع میں ہے۔ یعنی وہ "ذلول" جو کہ زمین پھاڑتی / ہل چلاتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے بھی ایک محذوف مبتدأ (ھی) کے ساتھ الگ جملہ سمجھا جائے یعنی "ھی تثیر الارضَ"۔ اگرچہ بعض کتبِ اعراب میں یہ سارے اعرابی امکانات مذکور ہوئے ہیں[1] تاہم درست بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسے صفت ہی سمجھا جائے اس لیے کہ فعل مضارع کا صیغہ اگر کسی اسم معرفہ کے ساتھ آئے تو عموماً اسے حال قرار دیا جا سکتا ہے جیسے کہیں "رأیتُ الرجل یکتب" (میں نے آدمی کو دیکھا کہ وہ لکھتا تھا یعنی لکھتے ہوئے دیکھا)۔ اور اگر صیغۂ مضارع کسی اسم نکرہ کے بعد ہو تو وہ عموماً اس (نکرہ موصوفہ) کی صفت ہوتا ہے۔ جیسے آپ کہیں "رأیت رجلاً یکتب" (میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو لکھ رہا تھا)۔

---

[1] مثلاً التبیان (للعکبری)، ۱: ۷۶

● بہرحال اگر اسے حال بھی سمجھا جائے تو بھی اردو میں حال کے ساتھ ترجمہ کرنا محاورے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لیے۔ اور شاید صفت ہی سمجھتے ہوئے بھی۔ اکثر مترجمین نے اردو میں اس کا ترجمہ بصورتِ صفت ہی کیا ہے۔ یہ تراجم [۲:۴۴:۱(۸)] میں گزر چکے ہیں۔

[وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ] میں "لا" تو فعل مضارع کو منفی کرنے کے لیے ہے اور "وَلَا" کی تکرار کے باعث (پہلے "لا ذلولٌ" کے ساتھ آیا ہے) اردو ترجمہ "اور نہ ہی" سے ہونا چاہیے۔ تاہم چونکہ بیشتر مترجمین نے "لا ذلولٌ" کا ترجمہ "نہ تو" ذلول (کمیری، محنت والی وغیرہ) ہے کرنے کے بعد (تثیر الارض) کا ترجمہ مثبت جملہ کی طرح "کہ زمین کو جوتتی ہو" وغیرہ کی صورت میں کیا ہے۔ [دیکھئے ۲:۴۴:۱(۸)]۔ اس لیے اس زیرمطالعہ منفی جملہ (ولا تسقی الحرث) کے ترجمہ میں غالباً اردو محاورے کی بنا پر "نہ ہی" نہیں لائے بلکہ سادہ منفی جملے کی طرح کر دیا ہے [دیکھئے ۲:۴۴:۱(۹)] ویسے "لا ذلول" کے "نہ تو" کے بعد یہاں "ولا" کا ترجمہ "اور نہ ہی" سے ہونا چاہیے مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس جملہ (لا تسقی الحرث) میں "لا تسقی" تو فعل مضارع منفی (واحد مؤنث غائب) ہے اور "الحرثَ" اس کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے۔ اور یہ پورا جملہ فعلیہ (لا تسقی الحرث) بھی "ذلولٌ" کی صفت (یا حال) ہے۔ اور پھر یہ پورا جملہ (لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث) زیرمطالعہ جملے میں بیان کردہ "بقرۃ" کی تین صفات میں سے پہلی صفت بنتا ہے۔ (یعنی ایسی گائے جو "ذلول" نہ ہو کہ ہل چلاتی اور آبپاشی کے کام آتی ہو)۔

[مُسَلَّمَةٌ] یہ اس (زیرمطالعہ اعرابی) عبارت میں "بقرۃ" کی دوسری صفت ہے۔ (یعنی "بقرۃٌ مسلّمۃٌ") اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں بھی ایک مبتدأ (ھی) محذوف ہے اور پھر "ھی مسلّمۃ" بصورتِ جملہ "بقرۃ" کی صفت بنتی ہے۔ [لَا شِيَةَ فِيهَا] میں "لا" تو نفی جنس والا ہے اور "شِيَةَ" اس کا اسم منصوب (مبنی بر فتحہ ے) ہے اور "فیھا" جار مجرور (فی + ھا) اس "لا" لنفی الجنس کی خبر کا کام دے رہا ہے لہٰذا محلاً مرفوع ہے اور یہ جملہ (لا شیۃ فیھا) "مسلّمۃ" کی صفت بھی بن سکتا ہے۔ (یعنی ایسی "مسلّمۃ" جو کہ "لا شیۃ فیھا" ہے۔ اور پھر یہ سب مل کر (مسلمۃ لا شیۃ فیھا) "بقرۃ" کی صفت بن سکتا ہے۔ (ایسی "صحیح سالم" جس میں کسی طرح کا داغ دھبہ نہ ہو)۔ اور بھی ممکن ہے کہ اس "لا شیۃ فیھا" (اس میں کوئی داغ نہیں) کو ہی "بقرۃ" کی تیسری صفت (پہلی "لا ذلول" دوسری "مسلّمۃ") سمجھ لیا جائے۔ "مسلمۃ لا شیۃ فیھا" کے تراجم کے لیے دیکھئے [۲:۴۴:۱(۱۱-۱۲)]۔

⑤ قالوا الآنَ جئتَ بالحق۔ ("الآن" کے رسم قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی) —— [قالوا] فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں ضمیر الفاعلین (ھم) بھی شامل ہے۔ [الآن] ظرف زمان (یعنی "اب۔اس وقت") فعل "جئتَ" سے متعلق ہے۔اور [جئتَ] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعل "أنتَ" (تو) ہے۔[بالحق] میں "باء" (ب) تو تعدیہ کے لیے ہے جس سے "الحقَّ" فعل "جئتَ ب ...." کا مفعول بنا ہے اور محلاً منصوب ہے۔اس کا ترجمہ وغیرہ [۲:۴۴:۱(۱۴)] میں گزر چکا ہے۔

⑥ فذبحوها وما كادوا يفعلون۔

ابتدائی فاء [فَ] عاطفہ ہے۔اور [ذبحوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" ہے اس میں "واو الجمع" (آخری واو) کے بعد والا الف زائدہ ضمیر مفعول کے ساتھ آنے کی وجہ سے نہیں لکھا گیا۔الگ فعل کی بات کرتے وقت سمجھانے کے لیے ہم نے یہ الف لکھا ہے۔[ھا] ضمیر منصوب اس فعل (ذبحوا) کا مفعول بہ ہے اور (اسی) ضمیر کے مفعول آنے کی وجہ سے "ذبحوا" کی بجائے فعل کو بصورت "ذبحو" لکھا گیا ہے [وَ] یہاں حالیہ ہی ہو سکتی ہے [ما] نافیہ ہے اور [کادُوا] فعل مقارب صیغۂ ماضی (جمع مذکر غائب) ہے اور اس کے بعد [یفعلون] فعل مضارع معروف (جمع مذکر غائب) ہے اور یہ وہ فعل ہے جسے نحو میں "کاد" کی خبر کہا جاتا ہے، کاد کے استعمال پر البقرۃ: ۲۰ [۲:۱۵:۱(۱)] میں بات ہوئی تھی۔اور جس کے ہونے یا نہ ہونے کو فعل "کاد" کا منفی یا مثبت استعمال متعین کرتا ہے۔خیال رہے اگر فعل مقارب (کاد) بصورت ماضی منفی ہو (جیسے یہاں "ماکادوا" ہے) تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ "وہ فعل ہو تو گیا اگرچہ ہوتا لگتا (ہونے کے قریب) نہ تھا" اور اگر فعل مقارب بصورت ماضی مثبت (مثلاً "کاد" وغیرہ) ہو تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ "وہ فعل (ابھی) ہوا تو نہیں اگرچہ ہونے کے قریب (آلگا) تھا"

۲:۴۴:۳ الرسم

زیر مطالعہ قطعۂ آیات (البقرہ: ۶۹-۷۱) میں بلحاظ "الرسم" صرف مندرجہ ذیل کلمات توجہ طلب ہیں۔یہاں فرق سمجھانے کے لیے پہلے ان کو عام "رسم املائی" میں لکھا جاتا ہے۔پھر ان کے رسم قرآنی یا عثمانی پر بات ہوگی۔یہ کل تین کلمات ہیں یعنی الناظرین۔تشابہ اور الآنَ۔ تفصیل یوں ہے:

① المناظرین۔ کا قرآنی (عثمانی) رسم باتفاق "حذف الالف بعد النون" کے ساتھ ہے یعنی یہ بصورت "النظرین" لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ اس طرح بصیغہ جمع مذکر سالم (اور بحالت نصب یا جر) قرآن کریم میں کل پانچ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ باتفاقِ علمائے رسم بحذف الالف بعد النون (یعنی "النظرین") ہی لکھا جاتا ہے۔ ترکی اور ایران کے مصاحف میں اسے عام رسم املائی کی طرح باثباتِ الف بعد النون لکھنے کی غلطی عام ہے۔ البتہ قرآنِ کریم میں دو جگہ لفظ "ناظرة" (واحد مؤنث) آیا ہے وہاں باتفاق اسے باثبات الف (مناظرة) ہی لکھا جاتا ہے۔ ان پر مزید بات حسبِ موقع ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

② تشابہَ: یہ لفظ جو باب تفاعل کا صیغہ ماضی (واحد مذکر غائب) ہے قرآن کریم میں اس (زیرِ مطالعہ) مقام پر باتفاق بحذف الالف بعد الشین یعنی بصورت "تشبہَ" لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں کل تین جگہ آیا ہے۔ (البقرہ: ۷۰، آل عمران: ۷ اور الرعد: ۱۶) اور ایک جگہ "تشابَهَتْ" (صیغہ واحد مؤنث غائب) بھی آیا ہے (البقرہ: ۱۱۸) اور پانچ چھ جگہ اس سے مشتق اسم الفاعل (متشابہ وغیرہ) آئے ہیں۔ ان میں سے صرف زیرِ مطالعہ آیت (البقرہ: ۷۰) میں ہی اسے "شین" کے بعد والے "الف" کے حذف کے ساتھ لکھنے پر اتفاق ہے (یعنی "تشبہ" کی شکل میں) باقی مقامات پر اس "الف" (بعد الشین) کے حذف و اثبات کے بارے میں "الدانی" اور "ابوداؤد" میں اختلاف ہے۔ ان مختلف فیہ کلمات (جن میں خود "تشابہ" بھی دو جگہ آتا ہے) کے اسم پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

③ الآنَ۔ یہ اس لفظ کا رسم املائی ہے اور یہاں جو بطور ضبط الف (بعد اللام) پر ایک مد (ـٓـ) ڈالی گئی ہے یہ بھی عام املائی ضبط ہے قرآن کریم میں اس قسم کی مد صرف اس الف ماقبل مفتوح (ـَـا) یا واو ماقبل مضموم (ـُـو) یا اس یاء ماقبل مکسور (ـِـی) پر لکھی جاتی ہے جن کے بعد کوئی ہمزہ (بصورت الف) سے لکھا جانے والا حرف آئے (جیسے مَآ اُنْزِلَ، قَالُوْٓا اٰمَنَّا اور فِيْٓ اٰذَانِهِمْ میں ہے)۔ الآن کی یہ مد اس قسم کی نہیں ہے بلکہ یہ عربی رسم املائی میں اردو کے آم، آج کی طرح لکھی جاتی ہے، قرآن کریم میں نہیں۔

● یہ لفظ قرآن کریم میں یہاں بالاتفاق بحذف الالف بعد اللام لکھا جاتا ہے یعنی بصورت "الٓـ"۔ اس کا ابتدائی ہمزہ تو ہمزۃ الوصل ہے مگر لام کے بعد والا ہمزہ قطع کا ہے۔ جسے پڑھا ضرور جاتا ہے اور اسے بذریعہ ضبط ظاہر کرنے کے مختلف طریقے ہیں جو آپ "الضبط" کے تحت دیکھیں گے۔

اصل عثمانی مصاحف میں ہمزہ کہیں بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ اہلِ زبان میں سے جو کسی لفظ میں ہمزہ پڑھتے (بولتے) تھے تو وہ سمجھ جاتے تھے اور جو اس لفظ میں ہمزہ نہیں بولتے تھے وہ اسے ہمزہ کے بغیر پڑھ لیتے تھے [دیکھئے البقرہ: ۱۴ [۲: ۱۱: ۳] میں "مستحضرون" کے رسم کی بحث] یوں اس لفظ کو لام اور نون کے درمیان ایک ہمزہ (بغیر نبرہ کے) لکھا جاتا ہے یعنی بصورت "الئٰن" تاہم افریقی مصاحف میں اس کے ضبط ظاہر کرنے کی اور صورتیں بھی ہیں جو آپ آگے دیکھیں گے مگر سب مصاحف میں اس لفظ کی اصل شکل "الن" ہی رہتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ آٹھ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح بحذف الف بعد اللام لکھا جاتا ہے۔ صرف ایک جگہ (الجن: ۹) میں یہ باثبات الف بصورت "الان" لکھا جاتا ہے۔ اس پر مزید بات اپنے موقع پر ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۲: ۴۴: ۴ الضبط

زیر مطالعہ آیات کے کلمات میں ضبط کا تنوع حسب ذیل نمونوں سے سمجھ سکتے ہیں۔

قَالُوْا، قَالُوا، قَالُوْا / ادْعُ ، اُدْعُ ، اُدْعُ / لَنَا، لَنَا، لَنَا / رَبَّكَ، رَبَّكَ / يُبَيِّنْ، يُبَيِّن، يُبَيِّن / لَنَا / مَا، مَا / لَوْنُهَا، لَوْنُهَا، لَوْنُهَا / قَالَ، قَالَ / اِنَّهٗ، اِنَّهٗ، إِنَّهٗ، إِنَّهٗ / يَقُوْلُ، يَقُولُ، يَقُولُ / اِنَّهَا، إِنَّهَا، إِنَّهَا / بَقَرَةٌ، بَقَرَةٌ / صَفْرَآءُ، صَفْرَآءُ، صَفْرَآءُ / فَاقِعٌ، فَاقِعٌ، فَاقِعٌ / لَّوْنُهَا، لَّوْنُهَا / تَسُرُّ، تَسُرُّ / النّٰظِرِيْنَ، النّٰظِرِينَ، النّٰظِرِينَ، النّٰظِرِينَ / قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا سب مثل سابق / مَا، مَا / هِيَ، هِيَ / اِنَّ، اِنَّ، إِنَّ / الْبَقَرَ، الْبَقَرَ، الْبَقَرَ / تَشٰبَهَ، تَشَٰبَهَ، تَشٰبَهَ، تَشٰبَهَ / عَلَيْنَا، عَلَيْنَا، عَلَيْنَا / وَاِنَّا، اِنَّا، إِنَّا، إِنَّا / اِنْ، إِن، إِن / شَآءَ، شَآءَ، شَاءَ، شَآءَ / اللّٰهُ، اللّٰهُ، اللّٰهُ / لَمُهْتَدُوْنَ، لَمُهْتَدُونَ، لَمُهْتَدُونَ / قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ (سب مثل سابق) لَّاذَلُوْلٌ، لَّاذَلُولٌ، لَاذَلُولٌ / تُثِيْرُ

تُثِيرُ، تُّثِيرُ / الْاَرْضَ، آلْاَرْضَ، اَلْاَرْضَ / وَلَا، لَا / تَسْقِي، تَسْقِي /
الْحَرْثَ، آلْحَرْثَ، الْحَرْثَ / مُسَلَّمَةٌ، مُسَلَّمَةٌ / لَاشِيَةَ، شِيَةَ /
فِيْهَا، فِيهَا، فِيهَا / قَالُوا / الْئٰنَ، آلْئٰنَ، اٰلْئٰنَ، اٰلْئٰنَ / جِئْتَ، جِئْتَ /
بِالْحَقِّ، بِالْحَقِّ، بِالْحَقِّ / فَذَبَحُوهَا، فَذَبَحُوهَا / وَمَا، مَا / كَادُوا، كَادُوا،
كَادُوا / يَفْعَلُونَ، يَفْعَلُونَ، يَفْعَلُونَ۔

بقیہ : حرف اول

کتاب میں شائع کرنا پیش نظر ہے' ان میں سے ایک تو محترم ڈاکٹر صاحب کا وہ فکر انگیز مقالہ ہے جو انہوں نے ۲۱/ اپریل ۸۶ء کو الحمرا آڈیٹوریم میں مرکزیہ مجلس اقبال لاہور کے زیر اہتمام یوم اقبال کی ایک تقریب میں "فکرِ اقبال کی روشنی میں' حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں" کے زیر عنوان پیش کیا تھا۔ مزید بر آں علامہ اقبال کی زندگی' ان کے فلسفہ خودی اور ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ کے پیغام' ایسے اہم موضوعات پر شارح کلام اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے بعض نہایت قیمتی مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح سید نذیر نیازی کا ایک اہم مقالہ "اقبال اور قرآن" بھی ان شاء اللہ شامل کتاب ہو گا۔ یہ کتاب اللہ نے چاہا تو جولائی کے آخر تک چھپ کر آ جائے گی۔ ○○

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علمی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

ضرور مطالعہ کیجئے ـــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۸۰ روپے ■ غیر مجلد -/۶۰ روپے

نوٹس داخلہ برائے ایف اے کلاس

قرآن کالج لاہور

قرآن کالج لاہور میں ایف اے سال اول کے داخلے ان شاء اللہ اگست کے پہلے ہفتے میں ہوں گے۔

ہر سال یہ شکایت موصول ہوتی ہے کہ داخلے کی اطلاع انٹرویو کی تاریخ گزرنے کے بعد ملی۔ اس صورت حال کے پیش نظر داخلے کے خواہش مند تمام طلبہ سے درخواست ہے کہ وہ میٹرک کے نتیجہ کا انتظار کئے بغیر پراسپکٹس منگوا کر جلد از جلد داخلہ فارم جمع کروا دیں' تاکہ انٹرویو کی تاریخ کا فیصلہ ہونے کے بعد انہیں براہ راست بذریعہ ڈاک مطلع کیا جا سکے۔

انٹرویو کے وقت تک اگر کچھ علاقوں میں میٹرک کے نتائج کا اعلان نہیں ہوا ہو گا تو ایسے طلبہ کو بھی مشروط طور پر داخلہ دے دیا جائے گا۔

تفصیلات کے لئے دس روپے کا ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' ۱۹۱۔ اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مُسلمانوں پر
قُرآنِ مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتہً پیش کیجیے۔